جمالِ دوست اسلوب پرست، ولیؔ

ولیؔ اردو شاعری میں ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی معنویت اور ان کے طرزِ ادا میں عجیب و غریب دل کشی پائی جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے ان کی زندگی اور شاعری کے مطالعہ میں بڑی دلچسپی لی جا رہی ہے خصوصاً دکن میں ان کے متعلق خاصا کام ہوا ہے۔ جو قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے جس کی وجہ سے ولیؔ کے رتبہ شناسوں اور مداحوں کو ان کے کلام کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

بایں ہمہ اس سارے تنقیدی ادب پر نظر ڈالتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے موقعوں پر وطن داری کے جذبہ کی وجہ سے ولیؔ کے اصل کارنامۂ شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں کچھ الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔ کیونکہ جب کسی فنکار یا ادیب و شاعر کو فن کار سے زیادہ ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے بھی پیش کرنا پڑتا ہے تو بسا اوقات تنقید، محبّت اور عقیدت کی رو میں بہ جاتی ہے۔ اور وہ نتیجہ نکالنا مشکل ہو جاتا ہے جو تنقید کا خاص مقصد ہے۔ جن جن شاعروں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے ان کے متعلق عموماً تنقید، تحسین کے مترادف بن کر رہ گئی ہے ——— ہمارے پہلے بڑے غزل گو ولیؔ کو بھی دوستوں اور قدر دانوں کی محبت کے اس امتحان سے گزرنا پڑا چنانچہ ان کے متعلق بعض ایسے تصوّرات پیدا ہو گئے جن کا تجربہ صحیح مطالعہ کیلئے

Scanned by CamScanner

از بس ضروری ہے۔

ولی کے متعلق اس سے زیادہ غلط بات شاید آج تک نہیں کہی گئی ہوگی ان کا کلام میر کے کلام سے بہت ملتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میر کا ادبی معشوق (ولی) باشندہ دکن کا تھا۔ مگر یہ کہ میر کا رنگ شاعری ولی کے رنگ شاعری سے ملتا جلتا ہے۔ اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ محسوس ..... ہوگا کہ ولی کی شاعری کی روح میر کی شاعری کی روح کی عین ضد ہے۔ میر کی الم پسندی اور غم دوستی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ مگر ولی کے کلام میں غم کے عناصر بمنزلہ صفر ہیں یہ ولی کی شاعری کا امتیاز خاص ہے کہ وہ اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کی غزل بلکہ سارے کلام کو پڑھ کر غم کی کیفیت پیدا ہونے کی بجائے طبیعت پر شگفتگی طاری ہو جاتی ہے ان کے عاشقانہ اشعار میں جذب و سرور اور شوق و نشاط کی لہر دوڑ رہی ہے اور غم کے خفیف ترین نشان اگر کبھی نظر بھی آتے ہیں تو معمولی تمانیت کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ولی کے کلام میں یاس و حرماں کے عناصر تقریباً مفقود ہیں بلکہ غم انگیز حسرت اور مہجوری بھی شاذ و نادر ہے۔ اس کے متعلق بھی میرا خیال یہ ہے کہ یہ صرف ان غزلوں میں ہے جو ممکن ہے ولی کی طرف غلطی سے منسوب ہو گئی ہوں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ کلام بتمام باولی کا نہیں۔ یہ میں خارجی تحقیق کی رو سے نہیں کہتا بلکہ ان داخلی شواہد کی بنا پر کہتا ہوں۔ جن کے سہارے ولی کا اصلی کلام رخیل سے صاف صاف الگ کیا جا سکتا ہے اور ان وجوہ سے ولی اور میر کو ہم رنگ سمجھنا یا سمجھانا ایک شدید ادبی مغالطہ ہے جس کا سبب یا تو ضرورت سے بڑھی ہوئی میر پرستی ہے یا غیر معتدل ولی پرستی۔ جس کے زیر اثر میر کی عظمت کے سہارے ولی کو بڑا بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ولی اپنے طرز خاص کے سبب بھی ایک بڑے شاعر ہیں۔

ولی کے متعلق یہ خیال بھی درست نہیں کہ انہوں نے دنیا کے کاروبار پر

Scanned by CamScanner

فلسفیانہ نظر ڈالی! ولی کی شاعری میں فلسفہ و فکر کا عنصر بے حد کمزور ہے ان کے خیالات میں کائنات کے اسرار اور زندگی کے رموز کے متعلق کم سے کم مواد ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس راز جوئی اور طلسم کشائی کی بجائے۔ جس کا نتیجہ سوا حیرت محرومی و افسردگی کے کچھ نہیں، زندگی کے جمال اور کائنات کے حسن سے سرور و مسرت حاصل کرنے اور نگاہ کی لذتوں سے سیراب و شادکام ہونے کو بہتر سمجھتے ہیں ولی نے اپنے جذب و سرور میں دنیا کی بے ثباتی جیسے مقبول مضمون و موضوع پر بھی کچھ زیادہ غور نہیں کیا حالانکہ یہ ہمارے شاعروں کا محبوب ترین موضوع ہے اور اس میں وہ کشش ہے کہ اس کی گرفت سے خیام اور حافظ بھی بچ کر نہیں نکل سکے ولی کے کلام میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ولی نے زندگی کے جمال پر نظر ڈالی ہے۔ اور اس کے ان پہلوؤں کو دیکھا ہی نہیں جن سے نظر میں تلخی اور نظریے میں پژمردگی پیدا ہوتی ہے۔ ولی نے فکر و حکمت کی گتھیاں نہیں سلجھائیں۔ انہوں نے چاند کی لذت بخش چاندنی اور آفتاب کی مسرت انگیز دھوپ، سپہر نیلگوں کی دل کشاں وسعت اور صبح و شام کے دلاویز حسن ہوتا شائی بننا اور ان سے حواس ظاہر و باطن کو مسرور بنانا سیکھا اور سکھایا ہے۔ ولی فلسفۂ زندگی کے ترجمان اور شارح نہ تھے۔ جمال زندگی کے دعاف اور "قصیدہ خواں" تھے

حسن و عشق کے موضوع پر بھی ولی کو ہم "ظاہر پرست" دیکھتے ہیں۔ ولی کا عشق دل سے زیادہ آنکھ سے متعلق ہے۔ ان کے کلام میں وہ قلبی جذبات، جو لازمۂ عشق ہیں کم سے کم ہیں اور جہاں کہیں ان کا شائبہ ہے بھی ان میں گہرائی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی کبھی ایسے عملی اور زندہ تجربۂ عشق سے دوچار ہی نہیں ہوئے جس کا نتیجہ الم اور درد ہوتا ہے ان کے مضامین ہجر و فراق میں سچائی معلوم نہیں ہوتی وہ شاید اس مرحلے سے گزرے ہی نہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ عشق کے متعلق ان کا تصور ایک بامراد عاشق کا تصور ہے مگر یہ

Scanned by CamScanner

عاشق ایسا عاشق ہے جسے ذوق نظر سے یا محض تصور سے ہی تسکین حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ صرف جمال کا عاشق ہے اور یہ جمال کسی ایک فرد یا ایک پیکر میں مقید نہیں بلکہ عام ہے جو بھونرے کی طرح ہر پھول کا شیدائی اور پروانے کی طرح ہر شمع کا متوالا ہے۔

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی یوں بوجہ کہ بلبل ہوں ہر ایک غنچہ دہاں کا

ہماری تنقید شعری میں کچھ عرصے سے ایک بدعت یہ چل پڑی ہے کہ کسی شاعر کے کلام کا جائزہ لیتے وقت اس بات کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کی زندگی میں کسی واقعۂ عشق یا حادثۂ محبت کی تلاش ضرور کی جائے اور پھر اس شاعر کی تمام شاعری کو اس کے گرد لپیٹ دیا جائے۔ چنانچہ فردوسی و نظامی سے لیکر ولی تک اور ولی سے لے کر آج تک تقریباً ہر شاعر کے متعلق تحقیقی سرمائے میں جستجو کا یہ پہلو بطور خاص نمایاں ہے۔ ولی کے متعلق بھی یہ کہا گیا ہے کہ "ولی کا ایک ساجن ہے جس کو وہ پیارے صدہا ناموں سے پکارتا ہے" (نذر ولی ص ۱۲) اور "ولی کے تخیل میں کسی خاص حبیب کا نقشہ تھا جس کا سراپا ایک عجیب دل کش انداز میں نمایاں ہے" (نذر ولی ص ۱۶) مگر میں کہتا ہوں ولی کا صرف ایک ساجن نہ تھا بلکہ ان کے پچاس ہزار ساجن تھے۔ گجرات اور اورنگ آباد کا ہر حسین و جمیل پیکر (جس پر ان کی نگاہ پڑ سکتی تھی) ان کا ساجن تھا۔ اگر ان کا صرف ایک ساجن ہوتا یا ان کے تخیل میں کسی "خاص حبیب" کا نقشا ہوتا تو ان کی شاعری کا رنگ اور انداز بیان جدا ہوتا ان کی شاعری کچھ اور طرح کی ہوتی۔

اور میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اگر انہیں حسینوں سے بے محابا میل جول کے عام مواقع بھی ملے ہوتے اور انہیں ان سے جسمانی طور پر بھی دل لگانے کا خیال پیدا ہوا ہوتا تو شاید ان کے کلام میں مصحفی یا حسرت کا رنگ ڈھنگ نمودار ہوا ہوتا مگر مجھے تو ولی کا عشق خیالی اور مثالی معلوم ہوتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ولی کیلئے یہ کس طرح ممکن تھا کہ کسی خاص شخص

Scanned by CamScanner

سے عشق کئے بغیر محبوب کے حسن و جمال کے پرشوق ترانے گاتے ؟ یا یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ سچے اور مقیّد عشق کے بغیر عاشقانہ جذبات کا مؤثر اظہار کر سکتے ؟ جواب یہ ہے کہ کسی شخص سے عشق کئے بغیر بھی حسن و جمال کے ترانے گائے جا سکتے ہیں اور عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ عشق انسانی فطرت کا لازمی جزو نہ ہے۔ اس کے دواعی ہر انسان کے جسم و جان سے پیوستہ و مربوط ہے۔ اس کے دواعی انسانی زندگی کے دواعی ہیں۔ زمانۂ شباب اس کے ظہور و بلوغ کا خاص زمانہ ہے۔ یہ امنگ اس سے قبل بھی غیر شعوری طور پر موجود ہوتی ہے اور زمانۂ جوانی کے گزر جانے پر بھی زندہ و محفوظ رہتی ہے دنیا کا ہر شخص خیالی طور پر عاشق مزاج ہوتا ہے چنانچہ وہ لوگ جنہوں نے شاعری نہیں کی، وہ بھی عشق کی بات پر سر دھنتے ہیں، اور تنہائی کے لمحات میں گنگناتے رہتے ہیں، اس طرح خیالی عاشقی مسلّم اور برحق ہے۔ البتہ ناکام عشق کے حوادث جن میں جذبات کا ماحول سے شدید تصادم ہوتا ہے، خال خال اور گاہے گاہے رونما ہوتے ہیں۔ غرض عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لئے ایک ساجن کے تقیّد کی ضرورت نہیں۔ شاعر کا خیال اپنے لئے کوئی نہ کوئی ساجن تراش لیتا ہے جو ہو سکتا ہے کہ بے نام اور موہوم ہو مگر جس کے لئے روح بے تاب اور بیقرار رہتی ہے ایسا محبوب موجود نہیں ہوا کرتا روح کو اس کی تلاش اور آرزو رہا کرتی ہے یہ انسان کا تصوّری محبوب ہے جسے بعض اوقات انسان مدالعمر ڈھونڈتا رہتا ہے مگر وہ پھر بھی نہیں ملتا اس جستجو میں وہ ہر حسین چہرے پر نظر ڈالتا ہے، ہر پیکر جمال سے دل لگاتا ہے۔ اس طرح حسن و خوبی کی ہر تمثال سے عشق و محبت کرتے ہوئے شوق کے نغمے گاتا رہتا ہے۔ مجھے تو ولی کے کلام کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح کے عاشق تھے اور ان کا ساجن بھی کچھ اسی طرح کا ساجن تھا۔

ولی کا عشق حقیقی تھا یا مجازی، اس میں بھی ایک غلط فہمی ہے۔ اپنی اصل کے

Scanned by CamScanner

اعتبار سے عشق کی سب صورتیں مجازی ہوتی ہیں۔ جس چیز کو عرف عام میں عشق حقیقی کہا جاتا ہے وہ بھی عشق مجازی ہی کی ایک صورت ہے کسی "غیر محسوس" محبوب سے دل لگانا محالات میں سے ہے اور اگر لگایا جا سکتا ہے تو اس میں تصوّر کی بنیاد مجازی ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، عشق کی سب صورتیں مجازی ہی ہوتی ہیں[1]۔ فرق صرف پردہ داری کا ہے۔ مجاز کو سامنے رکھ کر حقیقت کی تلاش ہو یا حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف مجاز میں تقید ہو، توجہات کا ظاہری مرکز مجازی ہے[2]۔ صوفی عموماً پردہ داری کو ضروری سمجھتے ہیں اور عشق کو اعلیٰ اور ارفع مقاصد روحانی کا ذریعہ بناتے ہیں اور یہ ان کا عام مسلک ہے۔ ممکن ہے ولی اس معاملے میں صوفیوں کے اس مسلک خاص کے متبع ہوں مگر اس حقیقت سے انکار نہ کیا جائے گا کہ خواہ ان کا عشق صوفیانہ ہو یا محض مجازی۔ یہ یقینی ہے کہ مجاز ان کے پیش نظر تھا اور اس میں وہ یک جائی نہ تھے ہرجائی تھے بلکہ ان کے اندازِ بیان کی تصورتیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اتنے ہرجائی تھے کہ محبوب کی تعریف و توصیف میں حسن کی جو تصویر وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں ہم اسے "پیکر خیالی" ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ شاعر کے فن کا کمال ہے کہ اس نے اس پیکر خیال اور نقش تصوّر کو انتہائی طور پر محسوس بنا کر ہمارے سامنے جلوہ گر کیا ہے۔

ولی کے فن کا بڑا کمال اسی پردہ داری میں ہے مجاز کی شدید پرستش اور حسن مجاز کی مسلسل توصیف سے ان کے عشق باز ہونے کا یقین ہوتا ہے مگر یہ محض پردہ داری ہے وہ حسن ظاہر کے ثنا خواں ہیں جو دنیا میں ہر جگہ مل جاتا ہے جسے مقید نہ ہونے پر بھی دیکھا جا سکتا

---

[1] ع حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے۔ (ولی)

اے ولی عشق ظاہری کا سبب — جلوۂ شاہد مجازی ہے

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

Scanned by CamScanner

ہے۔ ان کی لذّت کوشی اور لذّت بخشی حسن ظاہر کی توصیف تک محدود ہے ان کے محبوب کے "مکھ" میں سب سے زیادہ دلکشی ہے یہ "مکھ" حسن کا دریا ہے اس کی جھلک سے آفتاب شرمندہ و بے تاب ہے اس مکھ کا صفحۂ رخسار صفحۂ قرآن ہے اس کے بعد درجہ بدرجہ آنکھ اور لب، خال (تل) اور قد غرض سراپائے جسم کی تعریف و توصیف اتنے عمدہ اور دلکش پیرایہ ہائے بیان میں کی ہے کہ ولی کو اردو شاعروں میں سب سے بڑا سراپا نگار کہہ دینے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا مگر یہ یاد رہے کہ شاعر کا تصوّر اتنا عام معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی مبالغہ کی وہ حد ہے کہ شاعر کسی ایسے حسین کا پرستار معلوم ہوتا ہے جس کی صفات کسی ایک انسان میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ ولی کا محبوب عام محبوب بھی معلوم نہیں ہوتا یہ صحیح ہے کہ ولی کی تمنا یہ ہے کہ ان کا محبوب ان کے گھر آنے دیا در ہے کہ ولی محبوب کی گلی میں ذرا کم جاتے ہیں، وہ اپنے محبوب کو اپنے ہی گھر جلوہ فرما دیکھنا چاہتے ہیں، کبھی کبھی ان کا محبوب ان کے گھر آتا بھی ہے تو اس طرح کہ اس کا خرام ناز غیر محسوس ہی رہتا ہے ؎

میرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آئے

یہ بھی دراصل اس محبوب کی تصویر ہے جو زمین پر شاید گامزن ہی نہیں ہوتا، جو ہے ضرور مگر راز کی طرح غیر محسوس بصر!

اس ساری طویل بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہ خیال کہ ولی کے کلام میں کسی خاص محبوب اور حبیب کا نقشہ پایا جاتا ہے، درست نہیں ہوتا۔ ولی کا سارا انداز بیان اس کی تردید کرتا ہے۔ ولی ایک حسن پرست جمال دوست شخص تھے اور ان کے پیش نظر حسن کا وہ جلوۂ عام ہے۔ جو ہر پیکر مجاز میں موجود ہے۔ مگر حسن کے لئے ان کی پیاس اتنی شدید ہے کہ وہ کسی ایک محبوب کے لطفِ حسن سے تسکین نہیں پا سکتے بلکہ ان کا ذوق ہرجائی اور ہمہ جائی ہے اسی لئے ان کے محبوب کی تصویر

Scanned by CamScanner

مثالی اور تصوری محبوب کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تشبیہوں کا انداز اور دوسرے پیرایہ ہائے بیان اس کے موید ہیں جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔

ولی کی عظمت ان کے منفرد اور عمیق تجربات میں نہیں بلکہ زیادہ تر اس میں ہے کہ انہوں نے تجربات کو ان کی نوعیت کچھ بھی ہو ایک ایسے پیرایۂ بیان میں ظاہر کیا ہے جو بذات خود حسن و لطف کا بے نظیر پیکر اور نمونہ بن گئے ہیں۔ چنانچہ باوجود اس تکرار کے جو ان کے مضامین میں ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر طبیعت مکدر نہیں ہوتی۔ تکرار کے باوجود تازگی کا احساس کلام ولی کا ایک خاصہ ہے اور یہ زیادہ تر ان کے فن کا کرشمہ ہے۔

ولی کے اس صناعی معجزہ کے عناصر ترکیبی میں ایک بڑا عنصر یہ ہے کہ انہوں نے انسانی حسن اور اس کے متعلقات کو فطرت اور کائنات کی حسین و جمیل اشیاء کے حسن و جمال کے مرقع میں اس طرح سجایا ہے کہ اس شیش محل میں حسن محبوب کی چمک دوبالا ہو گئی ہے۔ ایک تو خود محبوب کا جمال جہاں آرا، اس پر سرمۂ حنا اور غازہ و گلگونہ کی حسن افزائی قیامت سے کم نہیں۔ ولی نے حسن کی ستائش میں کچھ ایسا ہی سماں پیدا کیا ہے۔ اس پر لفظوں اور ترکیبوں کی شیرینی اور اشعار کی موسیقی ان سب کی وجہ سے ولی کا فن سچ مچ اعلیٰ فن کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اردو شاعری ازبسکہ فارسی شاعری کی گود میں پلی ہے۔ اس لئے اردو شاعری کو فارسی شاعری کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنا شاید مناسب ہوگا اس پہلو سے اگر ولی کے فن کو دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کلام عراقی طرز کی طرف میلان رکھتا ہے۔ مگر اس میں طرز افغانی کے خفیف اثرات بھی گھل مل گئے ہیں طرز عراقی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں معاملات عشق کے بیان کی نسبت احساسات حسن کا بیان زیادہ ہے عشق کے وہ معاملات جن میں محبوب سے ملاقات اور مکالمہ و گفتگو کے پہلو نکلتے

Scanned by CamScanner

ہیں ان کی تشریح و تصویر کم ہے۔ عموماً محبوب کے حسن پر زور دیا جاتا ہے اور عشق کے صرف وہ احساسات جن کا تعلق یاد سے ہے بیان ہوتے ہیں محبوب کی اداؤں کا بیان اور محبوبیت کی نفسیات کی تشریح (جو بہرحال قربی ملاقات کی محتاج ہے) عراقی طرز کی شاعری میں خال خال ہے۔ اس رنگ کو تیز کرنے میں صوفی مزاج شاعروں نے بڑا حصہ لیا ہے جو پاک نظری اور عشق عفیف کے بلند نصب العین کی پاس داری میں عموماً عشق کو بشریت کے بیشتر پہلوؤں سے پاک و صاف رکھنے اور مجرد رنگ میں پیش کرنے پر بڑا اصرار کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا محبوب ایک بے نام موہوم اور خیال کا پیکر بن کر رہ جاتا تھا۔ حافظ سے لے کر جامی اور ہلالی تک عراقی شاعری کا محبوب ایک خیالی صنم سے زیادہ کچھ نہیں۔ مضمون اور معنی کی اس خصوصیت سے بیان کے انداز بھی مختلف ہو گئے ہیں۔ کسی عاشقانہ کہانی میں جب معاملات کی بحث آنے ہی نہیں پاتی اور اداؤں کا بیان بھی خالی ہوتا ہے تو پھر شاعر کے پاس مضمون ہی کونسے باقی رہ جاتے ہیں؟ لامحالہ وہی یاد، وہی ہجر و فراق، اور ان کے بعد وہی حسن کی ستائش جس میں واقعیت سے زیادہ خیالی تصورات کام کرتے ہیں۔ فارسی شاعری کے اس انداز نے حسن محبوب کو فطرت کی حسین و جمیل اشیا کی مشابہتوں کے حوالے سے سمجھانے کے طریقہ کو ضرورت سے زیادہ عام کیا۔ چنانچہ گل و سنبل، لالہ و ریحان، یاقوت و مرجان، ناف و غالیہ اور دوسرے اجسام لطیف کا تذکرہ عام اس رنگ شاعری کا ایک خاصہ بن گیا جس سے کسی حد تک فارسی شاعری بدنام بھی ہوئی۔ اس پر صوفی شاعروں نے یہ اضافہ کیا کہ تشبیہات میں وہ تنزیہی اور تجریدی رجحان سامنے رکھا جس سے مجاز کا رنگ پھیکا پڑ جائے اور طبائع حقیقت یا ماورائیت کی طرف مائل ہیں۔

فارسی شاعری کے اس مقبول طرز کے خلاف کامیاب احتجاج یا بغاوت نعمانی

Scanned by CamScanner

نے کی جن کی وجہ سے شاعری غزل۔ صرف حسن کا بیان ہی نہیں بلکہ شاعر کے قلبی جذبات واحساسات کے علاوہ معاملات کی ترجمان بھی بنی۔ اور ایک ایسے محبوب کا تصوّر سامنے آیا جس سے ملاقات اور بات چیت اور گلہ وشکایت ممکن العمل قرار پائی۔ تازہ گولیوں کا یہ ملک ایران سے ہو کر ہندوستان میں پہنچا اور یہاں نظیری عرفی شکیبی اور دوسرے شاعروں نے اسے مقبول عام بنایا اور اس میں وہ وہ گل کاریاں کیں جن کی تشریح کیلئے ایک ایک کتاب کی ضرورت ہے۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے!

ولی کا رنگ شاعری بھی عراقیوں کے طرز سے کچھ زیادہ قربت رکھتا ہے۔ کھیم داس اور امرت لال اور شمس الدین ولی کے محبوبوں کے نام) کی تعین کے باوجود اور مجاز کے گہرے رنگ کے باوجود ولی کے اصل رجحانات تنزیہی اور تجریدی ہیں ولی کے کلام میں غزل کے دوسرے مضامین کی کمی۔ بلکہ فقدان۔ کائنات کی حسین وجمیل اشیا کے مکرر حوالے مبالغہ واغراق کی صورتیں۔ سب کی سب اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ولی فارسی شاعری کی عراق طرز کے دل دادہ ہیں اور عراقیوں میں بھی ان کا رنگ جامی کے رنگ کے قریب ہے جن کی غزلوں میں خال وخط اور عارض ورخسار کا بیان اس تکرار اور مبالغے سے ہے کہ بعض اوقات پوری غزل کتاب حسن کی فہرست مضامین معلوم ہوتی ہے۔ ولی کا بھی یہی حال ہے ان کی اکثر غزلیات میں ستائش حسن کا یہی انداز ہے۔ وہ حسن کے افراد یا جزا کو زیادہ پیش نظر رکھتے ہیں حسن کے مجموعی تاثر کا بیان ذرا کم ہے۔ اس ضمن میں ولی کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

ترا لب دیکھ حیوان یاد آوے — ترا مکھ دیکھ کنعان یاد آوے
ترے دو نین دیکھوں جب نظر بھر — مجھے تب نرگستان یاد آوے
تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے — مجھے لیل زمستاں یاد آوے

Scanned by CamScanner

ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے — بہار سبستان یاد آوے
ترے مکھ کے چمن کو دیکھنے کوں — مجھے فردوس رضواں یاد آوے
تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے — اُسے شمع سبستان یاد آوے
جو میرے حال کی گردش کوں دیکھے — اُسے گرداب گرداں یاد آوے
ولی میرا جنون جو کوئی دیکھے — اسے کوہ بیاباں یاد آوے

اس غزل میں پہلے چھ شعر فہرست افراد حسن ہیں اور سب چہرے کے ماحول سے متعلق ہیں صرف دو شعر الگ ہیں جو شاعر کے حال کے شارح ہیں۔ جامی کی غزل میں بھی افراد حسن کی فہرست سازی کی یہ صورت موجود ہوتی ہے[1] مگر جامی ولی کے مقابلے میں غزل کے تقاضوں کو زیادہ جانتے ہیں۔ انکی غزل میں مضامین کا تنوع زیادہ ہے کیونکہ اس کے بغیر غزل کا دائرۂ خطاب محدود ہو جاتا ہے اور اس میں غزل کی یہ خوبی نہیں رہتی کہ اس کا ہر شعر ایک سمٹی ہوئی نظم ہوتا ہے جس میں مختلف (نہ کہ متضاد) مضامین ادا ہونے سے ہر غزل گلدستۂ معانی بن جاتی ہے اور اس کا دائرۂ خطاب مختلف طابع کے حسب حال ہونے کی وجہ سے وسیع ہو جاتا ہے۔ جامی نے اس کا بڑا خیال رکھا ہے اور حافظ نے تو اس احتیاط کے باریک پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا اس کے پیش نظر ولی کا متغزلانہ فن جامی وغیرہ کی سطح بلند سے فروتر ہے اس کے علاوہ جامی کا محبوب ترکانہ شیوہ شمائل کا حامل ہے۔

---

[1] جامی

اے بردہ رخت رونق گلی ہا و سمن ہا — دارد دہن تنگ تو در غنچہ سخن ہا
گر سرو نہ چوں قد تو باشد نتواں برد — چوں آب بزنجیر مرا سوئے چمن ہا
صحرائے عدم لالہ ستاں شد چو شہیداں — باداغ تو رفتند بخوں غرقہ کفن ہا
مشکل کہ بود روئے خلاصی دل ما را — از زلف تو با ایں ہمہ خم بار شکن ہا
با لذت، آوارگی لذت عشقست — غربت زدگان را نشود میل وطن ہا
چوں خامہ بوصف رخ او خشک فرو ماند — جامی کہ خدا انگشت نما در ہمہ فن ہا

Scanned by CamScanner

جو سمندر ناز پر سوار ہو کر عاشق کے سامنے سے بصد کبر و ناز تیر کی طرح نکل جاتا ہے مگر ولی کا محبوب "گل باغ حیا" اور "گوہر کان حیا" ہے۔ اور گھریلو طور طریق رکھتا ہے جس میں وہ ترکانہ انداز موجود نہیں جو جامی کے محبوب میں ہیں۔

گذشتہ سطور میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ فارسی کے عراقی شاعروں نے حسن محبوب کو حسن فطرت سے ہم آہنگ کرنے کیلئے نیچر کی مشابہتوں سے بڑا کام لیا ہے ہر چند کے معمولی سطح پر یہ فارسی اردو شاعری میں ایک عام بات ہے مگر "عراقیوں" کے یہاں یہ رنگ بہت شوخ ہے۔ ولی کی طرز میں بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ اس میں حسن انسانی کی شرح و تفسیر کیلئے کائنات کے دوسرے اجزائے جمال اور صور حسن سے غیر معمولی کام لیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ولی کی تشبیہات کی فہرست اور شاعروں کے مقابلے میں زیادہ طویل، زیادہ وسیع اور زیادہ "حسین و جمیل" ہے۔

فارسی اردو شاعری کے سلسلے میں جب تشبیہ و استعارہ کا ذکر آتا ہے تو نقد و نظر کا جدید مذاق کبھی کبھی اس تذکرے کو سنکر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور عموماً اس پر ناگواری کا اظہار کرتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ تشبیہ دراصل تمام خیالی ادب کی جان ہے اس کے بغیر وہ چیز جسے ایڈیشن نے "تجربے میں شے کے اضافے" کے نام سے تعبیر کیا ہے ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ تشبیہات سے اور امور کے علاوہ شاعر مشاہدات نقطۂ نظر اور رجحانات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاعر کی پیکر تراشی اور تصویر تراشی کے انداز اور طریقہ اسی سے معلوم ہوتے ہیں اور اسی سے اس کے ذہن اور باطن کے چھپے ہوئے اسرار جن کے صحیح نتائج اور اثرات کو شاید وہ خود بھی نہیں جانتا دنیا پر منکشف ہو جاتے ہیں کسی شاعر یا ادیب کے فن کے مختلف عناصر میں یہ عنصر اس کے بیان اور کلام کی مخصوص فضا تیار کرنے میں بڑا دخل رکھتا ہے۔

ولی کے سلسلے میں یہ دعویٰ شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کے کلام (غزل) میں حسن

Scanned by CamScanner

اور لطف کا ایک بڑا ذریعہ ان کی تشبیہات ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ان کے طریق تشبیہ کے بعض مخصوص رجحانات ہیں جن سے ان کے کلام کے پوشیدہ اسرار کا پتہ چلتا ہے اور ان کی روح اور ذہن کی بعض مرغوب اور محبوب تمناؤں کا اظہار ہوتا ہے اور جو بہرحال ان کے تجربات اور ان کے اظہارات کے تابع اور ان سے ہم آہنگ بھی ہے۔

ولی کی عام تشبیہات تو شاید نہیں۔ اکثر وہی ہیں جو قدیم زمانے سے فارسی شاعری میں مروج ہیں مگر اس تمام سلسلۂ عمل میں چند پہلو ایسے ہیں جن سے ولی کے فن کو امتیاز نصیب ہوتا ہے۔

اوّل:۔ ان کی تشبیہوں کا تنزیہی رجحان

دوم:۔ ان کی تشبیہوں میں تنزیہی رجحان کے باوجود اصل خیال کے نقش کا قائم رہنا۔

سوم:۔ ان کی تشبیہوں کا عموماً آرائشی ہونا اور آزاد یا معنی یا وضاحت کی بجائے ان سے شعر کی خارجی فضا اور رنگ کی نمود۔

چہارم:۔ تشبیہ کے طریقوں میں جدت اس مقالے میں ولی کے تصور محبوب کے سلسلے میں یہ ذکر آچکا ہے کہ وہ ہرجائی اور ہمہ جائی مذاق کے آدمی معلوم ہوتے ہیں اسی کو ان کی صوفیانہ حقیقت پسندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کا فن یہ ہے کہ انہوں نے حسن کی مجازی اوصاف کا رنگ بڑا شوخ رکھا ہے مگر اس حسن کی مزید تشریح و توصیف کے لئے تنزیہی اور تجریدی طریق کا اختیار کیا ہے یعنی مشبہ بہ کا رنگ مشبہ سے عموماً پھیکا اور مدہم ہے۔ مشبہ اگر محسوس ہے تو مشبہ بہ عقلی ہے اگر مشبہ بہ محسوس ہے تو بھی اسکا وصف مشترک مشبہ کے مقابلے میں مدھم اور دھیما ہے ان کی تشبیہیں واضح سے مبہم کی طرف سفر کرتی ہیں عموماً حسی مضمون کو عقلی اور خیالی مشابہت کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس کی وجہ سے محبوب کے تصور کا جسمانی رنگ کچھ پھیکا پڑ جاتا ہے اور

Scanned by CamScanner

مجاز کی شوخ شعاعیں جن کی روشنی میں ولی ایک لذّت پرست، مجاز پسند بلکہ ہوس کار آدمی معلوم ہو سکتے تھے۔ قدرے کمزور اور پیلی پڑ جاتی ہیں اور وہ محض جمال پسند اور پاک نظر آدمی کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتے ہیں اور اس کے باوجود مجاز کے تصوّرات کا لطف کم نہیں ہونے پاتا۔ ان کے نفس کے اس نقش لطیف کا اظہار ان کی تشبیہوں سے اور تشبیہ کے مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ جن کی کچھ تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔ ولی کی تشبیہوں کے تنزیہی رجحانات کئی صورتوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ان میں نمایاں صورت یہی حس سے عقلی کی طرف سفر ہے مثلاً ان اشعار میں :-

توں سر سوں قدم تلک جھلک میں
گویا ہے قصیدہ انوری کا
ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے
نین جامی جبیں فردوسی اور ابرو ہلالی ہے
ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا جو شوق و مائل
تو ہر اک بیت خالی اور ہر مصرع خیالی ہے
ولی لکھتا ہے تیری مست انکھیاں دیکھ اے ساقی
بیاض گردن مینا اوپر دیوان جامی کا
دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع الانوار کا

مشابہتوں کے احساس کی یہ صورت (ایہام کی صنعت کی مدد سے) ولی کے دیوان میں جا بجا ملتی ہے۔ ایہام سے کلام میں لطف کا ایک خاص پہلو یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بیک وقت قاری کے خیال کے سامنے معانی اور تصوّرات کے دو رنگ نمودار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے ایک حسی ہوتا ہے دوسرا عقلی۔ بعض اوقات

Scanned by CamScanner

دونوں حسی ہوتے ہیں۔ مگر دو دو قرینے شعر کے اصلی خیال میں پیوست ہو کر لطف کا باعث ہوتے ہیں۔

چہرۂ گل رنگ و زلف موج زن خوبی منیں
آیت جنات تجری تحتہا الانہار ہے

یہاں مشبہ بہ عقلی بھی ہو سکتا ہے اور حسی بھی

یٰسین طٰہٰ والضحیٰ نازل ہوئے تجھ شان میں
واللیل اور والشمس ہے تجھ زلف و مکھ کے درمیان
مصحف مکھ ترا ہے سورت فجر
مجھ کو والنجم والہوی کی قسم

ولی کے تنزیہی رجحان کی ایک صورت مشابہتوں میں مبالغہ کے ذریعے لاانتہائیت اور ماورائیت کا احساس پیدا کرنا ہے۔ یہ خصوصیت عام صوفی شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ ولی بھی اس خصوصیت میں شریک ہیں۔ ولی کو دریا کی وسعتوں اور آفتاب کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تابانیوں کے تصور سے بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب
تجھ حسن کی آگن کا ہے ہر اخگر آفتاب

مکتب میں جس کے ہاتھ ادا کی کتاب ہے
خوبی منیں وہ ہم سبق آفتاب ہے

بعض اوقات مبالغوں کی یہ صورتیں موہوم پیکر تراشی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جن کا احساس اور تصور حواس اور عقل دونوں کی گرفت سے باہر ہو جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

دیکھ اے اہل نظر سبزۂ خط میں لب لعل
رنگ یاقوت چھپا ہے خط ریحاں میں آ

شاخ گلی ہے یا نہال راز ہے
سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

تجھ دہن نے کہ میم معنی ہے
دل سیماب میں مقام کیا

مادر ہیٹ کا رجحان کبھی دقت اور ابہام کی صورت اختیار کرتا ہے :-

نہ پوچھو کیوں ہوا ہے کم سخن وہ دلبر رنگین
لب تصویر پر ہے رنگ دائم لاجوابی کا
کتاب بھیجنی ہے شمع بزم دل کوں اے کاتب
پر پروانہ اوپر لکھ سخن مجھ جاں فشانی کا

ولی کے اس تجریدی رجحان کا مزید ثبوت ان کی تشبیہی اور استعاری ترکیبوں کے مبالغوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً بہار بازدار چمن زار حیا، حسن موج جو بہار چمنستان ادا جنت احباب تمنا، شعلہ زار حسن۔ مثلاً ایک مثال :-

ظاہر ہوا ہے مجھ پہ ترے نازسوں صنم
رنگیں بہار حسن بہار عتاب ہے

میر اور غالب دونوں کی تشبیہات و تلمیحات میں انتقال ذہنی کا رخ شعری صداقت سے منطقی صداقت کی طرف ہے۔ وہ فارسی اردو شاعری کی ان مشابہتوں کی عموماً تردید کرتے ہیں جو مسلمات کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ میر کے ذہن کو ان

Scanned by CamScanner

مشابہتوں میں تکلّف محسوس ہوتا ہے چشم محبوب کو چشم آہو سے لب محبوب کو یاقوت سے اور قامت محبوب کو سرو چمن سے مشابہت دینے میں مشبہ بہ کو جو بے جا ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اس کو میر کا ذوق جمال گوارا نہیں کرتا ان کا ذوق یہ کہتا ہے کہ محبوب کا حسن اور اس کے اجزا اتنے دلکش ہیں کہ ان بے جان چیزوں کو ان کے مقابلہ پر لانا حسن محبوب کی توہین ہے یہی وجہ ہے کہ (میر اور غالب) دونوں عموماً شاعری کے بعض مسلمات متعارفہ کی تنقیص کرتے ہیں اس سے ان کا احتجاجی اور جارحانہ اور باغیانہ بھی (درجہ بدرجہ) ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ اور منطقی صداقتوں کیلئے ان کے میلان کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس کے برعکس ولی شعری صداقتوں کے پابند ہیں اور مسلم مشابہتوں کی پاس داری کرتے ہیں اور حسن محبوب کی تصویر میں فطرت کی جمیل اشیا کی مشابہت کے رنگ بھرتے ہیں۔ وہ ان مشابہتوں کے باغی اور انکاری نہیں جو فارسی شاعری میں از ابتدا موجود ہیں بلکہ انہیں کا تتبع کرتے ہیں۔ حسن محبوب اور حسن فطرت دونوں کو ایک سطح پر رکھنے سے سوا اسکے کیا ظاہر ہو سکتا ہے کہ جس محبوب کی جسمانی [illegible] یہ کہ وہ بظاہر بہت بڑے مصور اور نقاش ہیں اسکا مجازی اور جسمانی تصور انکے ذہن میں بیحد مبہم اور بھیکا ہے وہ انسانی حسن کو فطرت کے "ناتراشیدہ" حسن کے برابر تسلیم کرتے ہیں اور یہ تصور ایک ایسے ہی آدمی کا ہو سکتا ہے جس کی حس نظر بکھری ہوئی اور ہرجائی ہوتی ہے اور اس کی آنکھوں میں حسن کی کوئی مخصوص صورت نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ شے ہوتی ہے جس میں تناسب کا معمولی سا پہلو بھی موجود ہے۔ یہاں میر اور غالب کا تصور حسن زیادہ مجازی اور "انسان پسند" ہے ولی اس معاملے میں ان سے مختلف ہیں کیونکہ وہ یہاں پہنچکر عاشق کم اور شاعر زیادہ ثابت ہوتے ہیں۔ حسن محبوب اور حسن فطرت کو ایک سطح پر رکھنے کیلئے انہوں نے جو طریق تشبیہ اختیار کئے ہیں وہ بھی توازن و مساوات کے آئینہ دار ہیں۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

Scanned by CamScanner

تعریف ترے قد کی الف دار مری جن
جا سرو گلستاں کو خوش الحاں سوں کہوں گا
یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا
اس سکھ کو ترے صفحۂ قرآن سوں کہوں گا

نو تل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا
نین دیوی میں پتلی پر ہے یا کعبہ میں اسود ہے
ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بہتر بھنور دستا

خط ترا ہے ضرور لشکر حسن
کاکل اس کے اوپر علم دستا

مشابہت کی یہ صورتیں ولی کے کلام میں غالب حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں مشبہ کو مشبہ بہ کے مقابلے میں صنعت حسن میں ترجیح بھی دی گئی ہے مگر میر کا سا حقیقت پسندانہ انداز جو ذیل کے شعر میں ہے۔ ولی کے کلام میں شاید کہیں بھی نہیں۔

وہ سیر کو وادی کی مائل نہ ہوا ورنہ
آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا

میر کے اسی شعر میں چشم غزالاں کی کتنی تحقیر پائی جاتی ہے اور "پاؤں تلے مل جاتا" میں محبوب کے بے پردہ خرام اور غرور حسن کی بے نظیر اور لاجواب تصویر موجود ہے۔ ولی

Scanned by CamScanner

کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی ۔

ولی کے ان رجحانات کا ذکر قدرے طویل ہو گیا ہے مگر ان سب باتوں سے ان کے ذہنی میلانات اور "عقائد" پر بڑی روشنی پڑتی ہے ۔ ولی کے آرٹ میں ان سب چیزوں سے ان کا انفرادی رنگ ظاہر ہوتا ہے ۔ ولی کے آرٹ کا انفرادی رنگ مجموعاً ان کے پیرایۂ بیان سے متعلق ہے اور اگر معانی اور پیرایہ بیان کو الگ الگ دیکھنے کی اجازت مل سکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ ولی کے پاس کوئی خاص معنی تو موجود نہیں البتہ ان کے پیرایہ ہائے بیان میں ندرت اور انفرادیت ضرور ہے ۔ وہ درحقیقت "پیرایۂ بیان" ہی کی بنا پر بڑے شاعر قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ ولی کے ان منفرد پیرایہ ہائے بیان میں ایک اہم چیز ان کا طریق تشبیہ ہے ۔ ان کیلئے وہ رنگا رنگ صورتیں اختیار کرتے ہیں کبھی محبوب سے گفتگو کر کے خود اسی کو اس کے حسن کا تصور دلاتے ہیں اور فطرت کی جمیل اشیاء کا اس کے سامنے تذکرہ کرتے ہیں ۔ مثلاً :-

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

کبھی غائبانہ انداز میں ایک واقعہ یا بیان کی صورت میں مشابہت کا اظہار کرتے ہیں

اس کی تعظیم ہوئی اہل چمن پر لازم
بلبل باغ نے جب مصحف گل یاد کیا

ولی کے پیرایہ ہائے بیان میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان میں اثرات اور نتائج کے حوالے سے حسن محبوب کا تصور دلایا گیا ہے ۔ ایسی صورتوں میں شاعر عموماً جملہ ہائے "تمیزیہ" کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے ۔ ان میں تمیزیہ مکانی جملے بھی ہیں اور تمیزیہ زمانی بھی اور یہ صورتیں جملۂ موصولہ اور جملۂ شرطیہ کے ذریعے

Scanned by CamScanner

بھی پیدا کی گئی ہیں۔

تجھ لب کی اگر یاد میں تصنیف کروں شعر
ہر شعر منیں لذّت شہد و شکر آوے

آوے اگر وہ شوخ ستم گر عتاب میں
جرأت جواب کی نہ رہے آفتاب میں
قلم نرگس کی جب لے کر لکھوں تجھ چشم کی خوبی
ہزاراں آفریں کرتا مرے گھر بعہری آوے

گر حال میں رقت کے ترے لب کوں کروں یاد
ہر اشک مرا رشک عقیق یمن آوے
یک گل کو اپس حال میں اس وقت نہ پاوے
جس وقت چمن بیچ وہ رشک چمن آوے
تری زلفاں کے حلقے پر تو جب دریا پہ چل جاوے
عجب نیکس اے پری پیکر اگر گرداب بل جاوے

یہ ساری غزل اسی پیرایۂ بیان کی حامل ہے، جس وقت جب جب سے اگر، کے ذریعہ ولی نے اثرات کے سینکڑوں تصوّر دلائے ہیں اور ان کے ضمن میں حسن محبوب کی مشابہتوں کو ابھارا ہے۔ یہ رنگ ولی کے پیرایہ ہائے بیان میں بڑی انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں پھر ہمیں ولی کے ایک خاص رجحان کا احساس ہوتا ہے ان کے شرطیہ جملے (اور ان کی اگر مگر) یعنی ایسا ہو تو" ایسا ہوگا" کا انداز ان کے ذہن کے شک اور لامرکزیت کو ظاہر کرتا ہے اس میں وہ اثباتی

Scanned by CamScanner

انداز نہیں پایا جاتا جو حقیقی معاملات عشق میں پایا جاتا ہے۔ اور جو سچے تجربات میں، یقین کامل کی وجہ سے مثبت اور قطعی پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے ولی کے کلام میں بڑی کثرت سے ایسے جملے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً،

"بجا ہے اگر"

"عجب نہیں اگر"

"لائق ہے اگر"

گرمی سوں وہ پری رو جب شعلہ تاب ہووے
برجا ہے دل جلوں کا سینہ کتاب ہووے
جو تجھ سوں ہو مقابل وہ شرم سوں عجب نئیں
جیوں عکس آرسی میں گر غرق آب آوے
تصویر تجھ پری کی دیکھا ہے جن نے اس کوں
برجا ہے گر تخلص حیرت مآب ہووے
تیرے لباں کے آگے برجا ہے اے پری رو
گر آب زندگانی موج سراب ہووے

اب آپ ملاحظہ فرمائیے۔

برجا ہے دل جلوں کا سینہ کباب ہووے

میں کتنا شک پایا جاتا ہے یہ ایک منطقی بیان ہے جس میں ایک امکان کا ذکر ہے کسی تجربے یا عمل کا نہیں۔ اس کے مقابلے میں "دل جلوں کا سینہ کباب ہو رہا ہے" کہنے میں جو واقعیت اور قطعیت ہے "وہ عجب نہیں، برجا ہے، بجا ہے، لائق ہے سزاوار ہے" وغیرہ میں کہاں ہو سکتی ہے اور اظہار کی یہ صورتیں کلام ولی میں تقریباً ہر ہر غزل میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ولی کے کلام میں تجربہ کی بجائے خواہش اور تمنا کا اظہار زیادہ

Scanned by CamScanner

ہے۔

اگر موہن کرم سوں مجھ طرف آوے تو کیا ہووے
ادا سوں اسقدر نازک کوں دکھلاوے تو کیا ہووے

اگر مجھ کن تو اے رشک چمن ہووے تو کیا ہووے
نگہ میری کا تیرا مکھ وطن ہووے تو کیا ہووے

تری باتاں کے سننے کا ہمیشہ شوق ہے دل میں
اگر تک دم تو مجھ سوں ہم سخن ہووے تو کیا ہووے

وغیرہ وغیرہ

ان تمناؤں میں شاعر کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ محبوب اس کے گھر آوے محبوب کی گلی میں جانے کے تذکرے ذرا کم ہیں اور عجب یہ کہ ولی کا چیدار محبوب اس کے گھر آیا بھی ہو تو کچھ اس طرح "جیوں سینے میں راز آئے" یہ سب خواب و خیال ہی کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔

ولی کے فن کا یہ خاص پہلو نہایت قابل توجہ ہے کہ اس قسم کے دھیمے خنک اور غائبانہ پیرایہ ہائے اظہار و بیان کی افسردگی اور "خنکی" کو دور کرنے کے لئے انہوں نے تقریباً ہر جگہ تلافی کی کچھ صورتیں بھی پیدا کی ہیں جن کی وجہ سے کلام میں باوجود مذکورہ بالا امور کے "خنکی" پیدا ہوتی نہیں کچھ گرمی اور جوش کا احساس ہوتا ہے۔ تلافی کی ایک بڑی صورت یہ ہے کہ ان کے جملے خبریہ اور غائبانہ بہت کم ہیں۔ اکثر خطابیہ اور ندائیہ ہیں جن کا مرجع خود محبوب کی ذات ہے جو ہر وقت ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی دکھائی دیتی ہے اور وہ دیوانہ وار اس کو مخاطب کر کے اس کے حسن کا قصیدہ خود اسی کے سامنے

Scanned by CamScanner

لگاتار پڑھتے ہیں۔ تجھ مکھ تجھ حسن، تجھ زلف، تجھ ناز، تجھ خال، تجھ نین اور اس قسم کے دوسرے جملات بار بار دہرائے جا رہے ہیں جن سے شاعر کے جنون شوق کا اظہار ہوتا ہے اور ایک ایسی پر لذت نشاطیہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بیان سے باہر ہے بس ولی کے معنی اور ان کے اسلوب کا خلاصہ اسی قدر ہے حق یہ ہے کہ معاملات اور حکیمانہ گہرائی اور دردمندی اور سوز و گداز کی کمی کے باوجود ان کا کلام بڑا خوش رنگ اور خوش گوار ہے۔ بہار آفریں الفاظ، خوش صورت تراکیب "گل و گلگشت" کی تکرار حسن کے ترانے اور نغمے مناسب بحروں کا انتخاب اور اسالیب فارسی سے گہری واقفیت اور ان سے استفادہ۔ ان سب باتوں نے ولی کو ایک بڑا رنگین شاعر بنا دیا ہے۔

میر اور دوسرے کبار متغزلین کے مقابلہ میں ان کی شاعری میں رمزیت ہے اور مضامین محدود ہیں مگر حسن کی ستائش اور جمال کی توصیف کا ترانہ اتنا رنگین اور دلکش ہے کہ کوئی شخص ولی کے پاس سے اعتراف کئے بغیر گذر نہیں سکتا۔ اس ترانے کو ضرور سنے گا، وہ ان نغموں سے ضرور محظوظ ہوگا۔ ولی حسن بیانی کے شاید سب سے بڑے اوصاف سراپائے محبوب کے بہت بڑے قصیدہ خواں ہیں اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ وہ اردو کے اولین اسلوب پرست شاعر ہیں جن کی شاعری ان کی معانی سے زیادہ ان کے اسلوب کی وجہ سے زندہ رہے گی۔

Scanned by CamScanner

DrMuhammad Ramzan

باب اوّل: حیاتِ میرؔ

میرؔ کے اسلاف

میر تقی میرؔ نے اپنے بزرگوں کا حال خودنوشت سوانح عمری ''ذکرِ میرؔ'' میں لکھا ہے۔ اور وہ ہی سب سے زیادہ مستند ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرے بزرگ زمانے کی نامساعدت سے اپنے قوم وقبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد دکن میں پہنچے۔ راستے میں بہت سی صعوبتیں اور مصیبتیں اٹھائیں وہاں سے وہ احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔ بعض تو ان میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے لیے آگے بڑھے۔ چنانچہ میرے جدکلاں نے دارالخلافۂ اکبرآباد میں توطن اختیار کیا۔ مگر آب وہوا کی ناموافقت سے بیمار پڑ گئے اور اسی بیماری میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک فرزند چھوڑا۔ جو میرے دادا تھے۔ انھوں نے تلاشِ معاش میں تگ ودو کی اور بہت زحمت ومصیبت کے بعد اکبرآباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے۔ شریفانہ بسر کرتے تھے۔ جب سن شریف پچاس سال کا ہوا تو علیل ہو گئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار گئے اور چند ہی روز بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

Scanned by CamScanner

ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گئے۔
چھوٹے بیٹے نے جو میرے والد تھے، درویشی اختیار کی اور ترک دنیا
کر کے بیٹھ گئے۔[1]''

علی متقی یا محمد علی؟

ارباب تذکرہ میرؔ کے والد کے نام میں اختلاف رکھتے ہیں۔ سعادت خاں ناصر،[2] حکیم عبدالحیٔ (صاحب گل رعنا)، مولوی محمد حسین آزاد (مصنف آب حیات) اور بلوم ہارٹ[3] ان کے والد کا نام میر عبداللہ لکھتے ہیں۔ گلزار ابراہیمی میں بھی یہی لکھا ہے۔ بیل نے محمد متقی مانا[4] ہے۔ اور سر شاہ سلیمان نے میر محمد علی نام اور علی متقی لقب یا عرف قرار دیا ہے۔[5]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اصلی نام علی متقی تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''ان کے (میرؔ کے) والد کا نام ذکر میر میں بارہا آیا ہے۔ میر صاحب کی
زبان سے ہو یا کسی دوسرے کی زبان سے ہو لیکن ہر جگہ علی متقی ہی لکھا ہے
اس سے وثوق ہوتا ہے کہ اصلی نام یہی تھا۔[6]''

لیکن یہ صحیح نہیں۔ ذکر میر میں صاف لکھا ہے:

''جوان صالح عاشق پیشہ بود، دل گرمی داشت، بہ خطاب علی متقی امتیاز
یافت۔[7]''

میرؔ کے والد کا نام بھی ذکر میر میں آیا ہے، جس سے شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

''خواجہ باسط کہ برادر زادہ صمصام الدولہ امیر الامرا بود، عنایتے بحال من
کرد و پیش نواب برد، چوں مرا دید، پرسید کہ ایں پسر از کیست؟ گفت از میر
محمد علی است فرمود از آمدنِ ایں پیدا است کہ ایشاں از جہاں رفتہ باشند۔''

ذکر میر کی ان دو عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کے والد کا نام محمد علی تھا اور لوگ انھیں ریاضت اور تقویٰ کی وجہ سے ''متقی'' کہنے لگے تھے۔[8]

میر محمد علی: حالات اور سیرت

Scanned by CamScanner

میرؔ نے اپنے والد کا حال خودنوشت میں لکھا ہے۔ ان کے انتقال کے وقت میر کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن ان کی سیرت کا اوّلین نقش انھیں کے ہاتھوں صورت پذیر ہوا تھا اس لیے ان کے حالات بھی مفصل طور پر جاننے کی ضرورت ہے۔

میرؔ نے لکھا ہے کہ میرے والد بڑے صوفی صافی اور درویش دلریش تھے۔ انھوں نے علم ظاہری جس کے بغیر عالم معنی تک پہنچنا دشوار ہے، شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی[9] سے حاصل کیا اور اُن ہی بزرگ کی رہنمائی میں بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ اور ترک و تجرید کی سعی میں بہت کچھ زحمت برداشت کی جس سے وہ درویشی کے اعلیٰ مقام تک پہنچے۔ جوانِ صالح اور عاشق پیشہ تھے۔ دل میں گرمی اور سوز رکھتے تھے۔ اس لیے علی متقی کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور حق تعالیٰ نے ہمیشہ انھیں ذلت سے محفوظ رکھا اور جب کبھی ان کی طبیعت شگفتہ ہوتی تو فرماتے کہ ''بیٹا! عشق اختیار کرو کہ عشق ہی اس کارخانہ پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق کے زندگانی وبال ہے۔ اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے اور عشق ہی بگاڑتا ہے۔

بے عشق نباید بود، بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی، عشق پسرے دارد''

میرؔ کے کلام کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ان خیالات کی بازگشت موجود ہے:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا آرزو عشق، مدعا ہے عشق
عشق سے نظم ہے یعنی عشق ہے کوئی ناظم خوب

ہر شے یاں پیدا جو ہوئی ہے، موزوں کر لایا ہے عشق
ظاہر باطن، اول آخر، پائیں بالا عشق ہے سب
نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق
موج زنی ہے میرؔ فلک تک، ہر لجہ ہے طوفاں زا

Scanned by CamScanner

سرتاسر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق
درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
سچ ہیں شاعراں خدا ہے عشق

اگر میرؔ صاحب کے والد کسی وقت استغراق اور مجاہدے سے فرصت پاتے تو کہتے کہ عالم میں جو کچھ ہے، عشق کا ظہور ہے، آگ سوزِ عشق ہے، پانی، رفتارِ عشق ہے۔ خاک قرارِ عشق ہے۔ ہوا اضطرارِ عشق ہے۔ موت، عشق کی مستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے۔ رات عشق کا خواب ہے، دن عشق کی بیداری ہے۔ تقویٰ قربِ عشق ہے، گناہ، بُعدِ عشق ہے، بہشت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے، اور مقام عشق تو عبودیت، عارفیت زاہدیت، صدیقیت، خلوصیت، مشتاقیت اور حبیبیت سے بلند و برتر ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ آسمانوں کی حرکت، حرکت عشقی ہے یعنی بمطلوب نمی رسند و سرگردانند۔

میرؔ نے بالکل یہی مضمون ایک شعر میں لکھا ہے:

مقصود گم کیا ہے تب ایسا ہے اضطراب
چکر میں ورنہ کا ہے کو یوں آسماں رہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کے یہ اولین نقوش، دھندلے نہیں ہوئے بلکہ خارجی ماحول نے ان کو اور چمکا دیا۔

میر کے والد دن کو کھوئے کھوئے سے رہتے اور رات کو عبادت میں مصروف رہتے (روز حیراں کار، شب زندہ دار اکثر روے نیاز بر خاک) وہ درویش پرست اور وسیع المشرب تھے، میرؔ نے لکھا ہے۔ ''چہرہ نورانیش رونق افزائے بزم صبح خیزاں، آفتابے بود اما از سایۂ خود ہم گریزاں۔'' جس وقت ہوش میں آتے تو فرماتے کہ ''بیٹا عالم کی حقیقت ایک ہنگامہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے دل نہ لگانا۔ عشق الٰہی اختیار کرو اور خدا سے لو لگاؤ، آخرت کی فکر لازم ہے۔ یہ دنیا گزرنے والی ہے اور زندگی وہم ہے۔ وہم کے پیچھے دوڑنا عبث ہے۔ چل چلاؤ لگا ہے اس لیے زادِ راہ کی فکر کرو ورنہ اس منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اُس سے رجوع کرو عالم جس کا آئینہ ہے اور

Scanned by CamScanner

اختیار اُس کو سونپو جس کو ہم اپنے میں ڈھونڈھتے ہیں۔ تمھارا وجود بے اس کے نہیں اور اُس کی نمود بے تیرے نہیں۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
لیکن نمی تواں کہ اشارت بدو کنند"

میرؔ نے لکھا ہے کہ میرے والد کامل فقیر[10] تھے اور بڑی دردمند طبیعت رکھتے تھے جب مجھے گلے لگاتے تو شفقت سے کہتے کہ اے سرمایۂ جان یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں چھپی ہے اور وہ کیسا سوز ہے جو تیری جان کے ساتھ لگا ہے۔ اس پر میں ہنس دیتا اور وہ رونے لگتے۔

ایک روز نماز اشراق کے بعد میری طرف توجہ فرمائی اور مجھے کھیلتا دیکھ کر کہنے لگے۔ "بیٹا! زمانہ سیّال ہے یعنی بہت کم فرصت۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس رستہ میں بہت نشیب و فراز ہیں دیکھ کر چلو:

نشان پائے تو فرد حساب زندگیست
قدم شمردہ دریں کہنہ خاک داں بردار

..... ایسے پھول کا بلبل بنو جو صد ابہار ہے..... فرصت کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو۔"

میرؔ کے والد کی صورت بڑی پاکیزہ اور متبرک تھی۔ چہرہ سے نور برستا تھا۔ اخلاق سنجیدہ اور وصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ کم کسی میں ہوگی۔ "طبعش مشکل پسند، جانش دردمند، مژگاں نم: حال درہم۔"[11]

ان کو علائق دنیوی سے نفرت تھی اور طبیعت ہجوم خلائق سے پرہیز کرتی تھی۔ بعض اوقات اس درجہ رقّت طاری ہوتی کہ ہچکی بندھ جاتی:

از بس گریستے گریاش در گلو گرہ گشتے نالہ کہ از دلش سر برزدے از آسماں گزشتے۔

میرؔ نے بعض اشعار میں اس کیفیت کو بیان کیا ہے جس میں مشاہدہ اور تجربہ کی صداقت شامل ہے:

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا
ہمیشہ چشم ہے نمناک، ہاتھ دل پر ہے — خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

Scanned by CamScanner

اختیار اُس کو سونپو جس کو ہم اپنے میں ڈھونڈھتے ہیں۔ تمھارا وجود بے اس کے نہیں اور اُس کی نمود بے تیرے نہیں۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
امّا نمی تواں کہ اشارت بدو کنند"

میرؔ نے لکھا ہے کہ میرے والد کامل فقیر[10] تھے اور بڑی دردمند طبیعت رکھتے تھے جب مجھے گلے لگاتے تو شفقت سے کہتے کہ اے سرمایۂ جان یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں چھپی ہے اور وہ کیسا سوز ہے جو تیری جان کے ساتھ لگا ہے۔ اس پر میں ہنس دیتا اور وہ رونے لگتے۔

ایک روز نماز اشراق کے بعد میری طرف توجہ فرمائی اور مجھے کھیلتا دیکھ کر کہنے لگے۔ "بیٹا! زمانہ سیال ہے یعنی بہت کم فرصت۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس رستہ میں بہت نشیب و فراز ہیں دیکھ کر چلو:

نشان پائے تو فرد حساب زندگیست
قدم شمردہ دریں کہنہ خاک داں بردار

ایسے پھول کا بلبل بنو جو صدا بہار ہے فرصت کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو۔"

میرؔ کے والد کی صورت بڑی پاکیزہ اور متبرک تھی۔ چہرہ سے نور برستا تھا۔ اخلاق سنجیدہ اور وصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ کم کسی میں ہوگی۔ "طبعش مشکل پسند، جانش دردمند، مژگاں نم: حال درہم۔"[11]

ان کو علائق دنیوی سے نفرت تھی اور طبیعت ہجوم خلائق سے پرہیز کرتی تھی۔ بعض اوقات اس درجہ رقت طاری ہوتی کہ ہچکی بندھ جاتی:

از بس گریستے گریاش در گلو گرہ گشتے نالہ کہ از دلش سر برزدے از آسماں گزشتے۔

میرؔ نے بعض اشعار میں اس کیفیت کو بیان کیا ہے جس میں مشاہدہ اور تجربہ کی صداقت شامل ہے:

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا
ہمیشہ چشم ہے نمناک، ہاتھ دل پر ہے خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

Scanned by CamScanner

اختیار اُس کو سونپو جس کو ہم اپنے میں ڈھونڈھتے ہیں۔ تمھارا وجود بے اس کے نہیں اور اُس کی نمود بے تیرے نہیں۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
امّا نمی تواں کہ اشارت بدو کنند"

میرؔ نے لکھا ہے کہ میرے والد کامل فقیر[10] تھے اور بڑی دردمند طبیعت رکھتے تھے جب مجھے گلے لگاتے تو شفقت سے کہتے کہ اے سرمایۂ جان یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں چھپی ہے اور وہ کیسا سوز ہے جو تیری جان کے ساتھ لگا ہے۔ اس پر میں ہنس دیتا اور وہ رونے لگتے۔

ایک روز نماز اشراق کے بعد میری طرف توجہ فرمائی اور مجھے کھیلتا دیکھ کر کہنے لگے۔ "بیٹا! زمانہ سیّال ہے یعنی بہت کم فرصت۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس رستہ میں بہت نشیب و فراز ہیں دیکھ کر چلو:

نشان پائے تو فرد حساب زندگیست
قدم شمردہ دریں کہنہ خاک داں بردار

..... ایسے پھول کا بلبل بنو جو صدا بہار ہے..... فرصت کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو۔"

میرؔ کے والد کی صورت بڑی پاکیزہ اور متبرک تھی۔ چہرہ سے نور برستا تھا۔ اخلاق سنجیدہ اور وصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ کم کسی میں ہوگی۔ "طبعش مشکل پسند، جانش دردمند، مژگاں نم: حال درہم۔"[11]

ان کو علائق دنیوی سے نفرت تھی اور طبیعت ہجوم خلائق سے پرہیز کرتی تھی۔ بعض اوقات اس درجہ رقّت طاری ہوتی کہ ہچکی بندھ جاتی:

ازبس گریستے گریاش در گلو گرہ گشتے نالہ کہ از دلش سر برزدے از آسماں گزشتے۔

میرؔ نے بعض اشعار میں اس کیفیت کو بیان کیا ہے جس میں مشاہدہ اور تجربہ کی صداقت شامل ہے:

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا
ہمیشہ چشم ہے نمناک، ہاتھ دل پر ہے — خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

Scanned by CamScanner

دل و جان سے ان کا معتقد ہو گیا۔ بیانہ سے وہ آگرے آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔

یہ نوجوان سید بھی اپنی نئی نویلی دلہن اور گھر بار چھوڑ کر میر محمد علی کی تلاش میں آگرہ آیا اور ان کی توجہ سے درویشی کے اعلیٰ مقام پر پہنچا۔ ان کا نام سید امان اللہ تھا اور ان کو علی متقی کی بڑی قربت حاصل تھی۔ میر کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ میر ان کو عم بزرگوار کہتے اور ہر وقت ان کے پاس رہتے۔

میرؔ کی ولادت

میر محمد تقی میرؔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:

''(وطن) اکبر آباد است۔ بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہ جہاں آباد است۔''[12]

میرؔ کے سن ولادت میں اختلاف ہے لیکن تاریخ وفات متنازعہ فیہ نہیں۔ ناسخ کے اس مصرع سے ''واویلا مُردشہ شاعراں'' تاریخ وفات ۱۲۲۵ھ، ۱۸۰۸ء نکلتی ہے۔[13]

آزاد نے میرؔ کی عمر ۱۰۰ سال قرار دی ہے جس کی رُو سے سن ولادت ۱۱۴۵ھ، ۱۷۳۲ء ہوا۔ مصحفی نے عقد ثریا میں میرؔ کی عمر کا ذکر نہیں کیا۔[14] لیکن اپنے دوسرے تذکرہ میں جس کا سن تالیف تقریباً ۱۲۰۹ھ، ۱۷۹۴ء ہے لکھتے ہیں:

''عمرش تخمیناً قریب ہشتاد ست''[15]

اس طرح میرؔ کا سال ولادت تقریباً ۱۱۳۷ھ، ۱۷۱۶ء لکھا ہے اور اس کی دلیل یہ قرار دی ہے کہ ذکر میر جو ۱۷۸۲ھ، ۱۱۹۶ء میں ختم ہوئی اس وقت میر کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔[16]

رام بابو سکسینہ نے بھی ۱۱۳۷ھ ہی کو صحیح جانا ہے لیکن سر شاہ محمد سلیمان نے ایک برس کم کر کے یعنی ۱۱۳۶ھ، ۱۷۲۳ء کو سال ولادت تسلیم کیا ہے۔[17]

خان بہادر جعفر علی خاں اثر نے نیرنگ کے میرؔ نمبر میں سن ولادت ۱۱۳۷ھ اور سن وفات ۱۲۲۵ھ لکھا ہے۔[18] مزار میرؔ میں بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔[19] اس سلسلہ میں نوادر الکملا کی حسب ذیل عبارت بیحد اہم ہے۔ جو میر کے دیوان چہارم کے ایک مستند قلمی نسخے[20] پر درج ہے۔ یہ نسخہ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

Scanned by CamScanner

''دراواخر یک ہزار و یک صد و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ''

اس دیوان کے سرورق پر محمد محسن شاگرد میر تقی میر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت موجود ہے۔

''بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یک ہزار و دو صد و بست و پنجم ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب، میر تخلص، صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سبٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بہ جوار رحمت ایزدی پیوستند و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ہم ازاں جملہ است بہ محرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہ در حین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدایش بیامرزاد۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر ۱۱۳۵ھ، ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے، ۹۰ برس کی عمر پائی اور ۱۲۲۵ھ، ۱۸۱۰ء میں انتقال فرمایا۔

سید امانُ اللہ

میر نے سید امان اللہ کی صحبت سے بڑا فیض اٹھایا ہے۔ سات سال کی عمر سے وہ اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ سید امان اللہ بھی ان کو اپنے بیٹے کی طرح رکھتے تھے اور ایک لمحہ کو اپنی نظر سے الگ نہیں کرتے تھے۔ میر نے لکھا ہے کہ میں روز و شب ان کے ساتھ رہتا تھا اور قرآن شریف پڑھتا تھا۔

میر نے ان کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، ایک روز میر امان اللہ جمعہ کے بازار کی سیر کو گئے۔ وہاں ان کی نظر ایک روغن فروش لڑکے پر پڑی۔ دیکھتے ہی دل قابو سے باہر ہو گیا۔ اور ضبط کی طاقت جاتی رہی۔ اس محبت کے غم میں اتنا ضعف ہو گیا کہ زمین پر پیر نہیں اتار سکتے تھے۔ ایک غلام کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑے ہوتے تھے۔ جب حالت بہت غیر ہو گئی تو پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ ان کی توجہ حاصل کریں۔ اس وقت حال یہ تھا کہ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر ٹھنڈی آہیں، حاضرین مجلس نے ان کو دیکھتے ہی جگہ کر دی، لیکن میر محمد علی نے انھیں صدر میں بٹھایا اور کہا۔ ''اے بھائی کہاں تھے۔'' عرض کیا کہ جمعہ کے بازار کی سیر کو گیا تھا، فرمایا کیا

Scanned by CamScanner

تم نے نہیں سنا:

دیدنِ طفلانِ تبہ بازار رسوامی کند

پھر فرمایا ''جاؤ آٹھ دن تک اپنے حجرے سے باہر مت نکلو اور خبردار کسی کے سامنے یہ داستان مت بیان کرنا حق تعالیٰ کریم ہے کیا عجب ہے کہ اس کی رحمت تمھارے شامل حال ہوا۔'' ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ وہ ماہ دو ہفتہ بے چین ہو گیا۔ اور بھاگا ہوا آستانہ اقدس پر حاضر ہوا۔ جو شہر پناہ کے باہر عیدگاہ کے قریب واقع تھا۔ میر محمد علی نے ایک غلام کو اشارہ کیا، اور کہا ''جاؤ برادر عزیز کو بلا لاؤ اس سے کہو کہ تمھارا مطلوب تمھیں ڈھونڈتا ہے۔'' میر امان اللہ دست افشاں و پا کوباں بھاگے ہوئے آئے۔ اور اپنے پیر کے قدموں سے لپٹ گئے۔ اس کے بعد اپنے مطلوب سے بغل گیر ہوئے۔ اس لڑکے نے کہا ''میں نے بہت تکلیف اٹھائی لیکن خیر خزانہ پالیا۔ اب اس آستانہ کی جاروب کشی کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔''

یہ نوجوان اپنی ریاضت سے مریدانِ خاص اور درویشانِ باصفا میں شمار ہونے لگا۔

میر صاحب لکھتے ہیں کہ میرے ''چچا'' کو درویشوں سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز وہ احسان اللہ نام ایک درویش کے پاس گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، اس فقیر کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دروازے پر آواز دیتا وہ کہہ دیتا کہ احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ میرے چچا نے کہا ''اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے۔'' وہ ہنسا اور اس نے فوراً دروازے کے کواڑ کھول دیے۔ ایک جوان شخص نظر آیا۔ شیر اندام، خورشید سوار، اس کے چہرے سے ہیبت حق ظاہر ہو رہی تھی۔ میر لکھتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں وہ بزرگ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا یہ لڑکا کس کا ہے۔ فرمایا علی متقی کا فرزند اور مجھ گنہگار کا پروردہ ہے۔ درویش نے فرمایا کہ یہ ابھی بچہ ہے۔ اگر اس کی بخوبی تربیت ہوئی تو ایک ہی پرواز میں آسمان کے اس طرف پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد درویش نے روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا پانی میں تر کر کے کھانے کو دیا۔ میر صاحب کا بیان ہے کہ اس میں مجھے وہ لذت ملی جو آج تک کسی کھانے میں نہیں ملی اور اس کا ذائقہ اب تک یاد ہے۔

میر صاحب نے احسان اللہ درویش کے انتقال کا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن ان کے پاس ایک گویا لڑکا آیا ''طنبورہ بردوش، حلقہ زر در گوش'' درویش نے میرے چچا سے کہا کہ اسے بلا

Scanned by CamScanner

لو اس نے آ کر یہ غزل پڑھنی شروع کی:

بیا کہ عمر عزیزم بہ جستجوئے تو رفت زدل نہ رفتی وجانم زآرزوئے تو رفت

اس کو سنتے ہی فقیر پر وجد کی حالت طاری ہوئی اور اس نے بڑا لطف اٹھایا اور کہا۔ ''اے عزیز آج کی رات تو یہیں رہ اور جو کچھ تجھے یاد ہے سنا۔'' اس نے قبول کیا۔ جب شام ہوئی تو اس نے ہم لوگوں کو رخصت کیا اور دروازہ بند کر کے یاد الٰہی میں بیٹھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ فقیر نے سوتے وقت اشرفیاں (جو نصرت یار خاں صوبہ دار شہر نذر کے طور پر دے گئے تھے۔) تکیہ کے نیچے رکھ لی تھیں۔ وہ اس لڑکے کی نظر پڑ گئیں وہ بازار سے ایک پیالہ دودھ کا زہر ڈال کر لایا اور درویش کو بڑے اصرار سے پلایا۔ زہر نے فوراً اپنا اثر کیا اور وہ بے مروت اشرفیاں لے کر بھاگ گیا۔

میر نے لکھا ہے کہ میرے چچا کو درویشوں کی خدمت میں سعادت حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا ایک روز معمول ہوا کہ ایک درویش بایزید نام سرائے گیلانی کے قریب جو سیلاب سے تباہ اور برباد ہو گئی تھی ٹھیرے ہوئے ہیں وہ فوراً ملنے کے لیے گئے، دیکھا کہ ایک جوان شکستہ دل، کشادہ روح، برشتہ جان، دلدادہ، بڑی بے کسی کی حالت میں پڑا ہے اور یاد حق میں مصروف ہے۔ نہ کھانے پینے سے رغبت رکھتا ہے اور نہ پہننے اوڑھنے سے، یہ درویش میرے چچا سے مل کر بہت خوش ہوئے اور زبان مبارک سے بہت نصیحتیں کیں ان نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ دیر و مسجد کی قید سے آزاد ہو جاؤ اور اگر مقصود تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی دل میں راہ پیدا کرو۔ میر کے کلام میں جا بجا ان خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے:

کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچہ کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

مت رنجہ کر کسو کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

شرکت شیخ و برہمن سے میر کعبہ و دیر سے بھی جایئے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد کسی ویرانہ میں بنایئے گا

Scanned by CamScanner

بایزید نے سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا تھا:

زنہار کہ دل شکنی کسے نہ کنی و سنگ ستم بر شیشۂ نہ زنی۔ دل را کہ عرش می گویند ازیں راہ است کہ منزل خاص آں ماہ است:

نیازارم زخود ہرگز دلے را کہ می ترسم درو جائے تو باشد

میر نے ان خیالات کو اکثر جگہ نظم کیا ہے:

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں
یہاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

سعی طوف حرم نہ کی ہرگز آستاں پر ترے مقام کیا
تیرے کوچہ کے رہنے والوں نے یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
عشق خوباں کو میر میں اپنا قبلہ و کعبہ و امام کیا
دیر و حرم میں کیوں کہ قدم رکھ سکے گا میر
ایدھر تو اس سے بت پھرے، اُدھر خدا پھرا

بایزید نے دوسری ملاقات میں میر کے سر سے ٹوپی اتاری اور پوچھا یہ کون ہیں؟ سید امان اللہ نے کہا علی متقی کے بیٹے ہیں۔ درویش نے کہا۔۔ہاں وہ تو بڑے بزرگ ہیں دانائے اسرار، خورشید آسماں، یہ اسی دریا کا موتی ہیں ہم فقیر تو ان کے مقابلہ پر بالکل تہی دست ہیں۔''

ایک روز میر امان اللہ میر کو لے کر پھر بایزید کے پاس پہنچے یہ تیسری اور آخری ملاقات تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ بایزید بیمار اور رنجور ہیں اور ایک پہلو سے لیٹے ہوئے آہ، آہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے سید امان اللہ کو دیکھ کر ایک سرد آہ کھینچی اور شفائی کا یہ شعر پڑھا:

پرستارے ندارم بر سر بالیں بیمارے مگر آہم ازیں پہلو بہ آں پہلو بہ گرداند

پوچھا کہ یہ کیا حال ہے؟ فرمایا اے عزیز میرا سینہ ایسے جل رہا ہے گویا اندر آگ سلگ رہی ہے۔ ہر نالہ آتش ہے اور ہر آہ ایک شعلۂ سرکش:

من نمی دانم کہ دل می سوزد از غم یا جگر آتش افتادست در جائے و دودے می کند

Scanned by CamScanner

اگر موت میری فریاد کو پہنچ جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو قرار، ہوا جو چلتی ہے اس آگ کو بھڑکا دیتی ہے۔ پانی جو پیتا ہوں وہ آگ پر تیل کا کام کرتا ہے۔ کاش کوئی میرے سینے کو چیر ڈالے اور دل وجگر کو باہر نکال پھینکے۔ زوال آفتاب تک اُن کا یہی حال رہا اور ظہر کی نماز پڑھتے ہی راہی عدم ہوئے۔ رات کو میرے چچا نے انھیں خواب میں دیکھا، بہت خوش تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''دیکھا تم نے! اس عشق نے میرے اندر کیسی آگ لگا دی تھی۔ اس کا علاج بجز موت کے اور کچھ نہ تھا۔ جب میرے محبوب نے میری بیتابی کو دیکھا تو مجھے رحمت کے سمندر میں ڈال دیا اور مجھے گوہر مقصود سے ہم کنار کیا۔''

میر امان اللہ میر محمد علی اور ان درویشوں کی سیرت اور شخصیت نے میرؔ کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے کلام سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ احسان اللہ کی بیخودی میں ایک عجیب کیفیت پوشیدہ تھی۔ میرؔ نے ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی حالت کو سامنے رکھ کر ان اشعار میں ان کی تصویر کشی کی ہے:

ملنے والوں پھر ملیے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

بیخودی پر نہ میرؔ کی جاؤ تم نے دیکھا ہے اور عالم میں
بیخودی لے گئی کہاں ہمکو دیر سے انتظار ہے اپنا
رہے ہم عالم مستی میں اکثر رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا
دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میرؔ
گہہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

میرؔ کے یہاں وہ بے دماغی بھی ہے جو بایزید کے یہاں نظر آتی ہے:

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جایئے — گل گشت کو جو آیئے آنکھوں پہ آیئے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا — وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھایئے
گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اس بن — جی جوا چنا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

بایزید کے دل میں جو آگ تھی اس کی چنگاری میرؔ کے دل پر بھی آ پڑی تھی وہ خود اس کوچہ سے گزرے تھے اور مصائب روزگار نے اس آگ کو بھڑکا دیا تھا۔ ان کی محرومی اور ناکامی کو بھی ان

Scanned by CamScanner

کی سیرت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عشق کی کیفیات کا اس صداقت اور خلوص کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ دل اور نظر دونوں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا
گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

بایزید نے خواب میں کہا تھا۔ ''دیدی کہ عشق چہ آتشے در من زد و چنانم سوخت چارۂ کار جز مرگ نبود۔'' اس قول کی روشنی میں میرؔ کے اس شعر کو دیکھیے:

چارۂ عشق بجز مرگ نہیں کچھ اے میرؔ اس مرض میں ہے عبث فکر تمھیں درماں کا

میرؔ کے والد نے ان کے زرد رنگ کو دیکھ کر کہا تھا۔ ''اے بیٹے تیرا رنگ زرد ہے تجھے کس کا درد ہے۔'' ان اقوال کی صدائے بازگشت ان اشعار میں سنائی دیتی ہے۔ تجربہ کی صداقت نے ان کو تیر و نشتر بنا دیا ہے:

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا
دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

ان بزرگوں کی اگر تصویروں کو سامنے رکھا جائے تو ان اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے:

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی درد مند کرے

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ پر ان صحبتوں کا گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے بے نیازی، خودداری، اور کم آمیزی اپنے باپ سے سیکھی۔ اور سوز و گداز اور جوش و خروش سید امان اللہ سے حاصل کیا۔ میرؔ کی سیرت میں ان تمام بزرگوں کی سیرت کے نقوش نظر آتے ہیں۔ اس کی گواہ ان کی زندگی اور شاعری دونوں ہیں۔

میرؔ کے ''چچا'' اور والد کا انتقال

Scanned by CamScanner

میرؔ نے اپنے والد کی وفات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور ایک عجیب نقل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے والد نے سید امان اللہ سے فرمایا ''اے برادر عزیز ہر روز ضعف بڑھتا جاتا ہے۔ اگر قرآن حفظ کر لو تو کیا اچھا ہو۔'' عرض کیا کہ بہت خوب۔ ایک روز دونوں باہم بیٹھے دور کر رہے تھے کہ ایک درویش اسد اللہ نام۔ نیلے کپڑے پہنے اور نمدی کلاہ اوڑھے وارد ہوا۔ جوں ہی میرے والد کے سامنے آیا آپ نے فرمایا۔ ''اے سیراب پز کبود جامہ اتنے دور دراز کا سفر تو نے کیوں اختیار کیا اور اس قدر زحمت اور مشقت کیوں اٹھائی۔'' درویش دوڑ کے قدموں پر گر پڑا۔ والد اس سے بغل گیر ہوئے اور اپنے قریب جگہ دی۔ چچا جان یہ اختلاط دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ کہا کہ میرے قدیم آشنا ہیں۔ وہ اور زیادہ متعجب ہوئے اس لیے کہ ان کو اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ فرمایا ''ہم دونوں ایک ہی آستانے کے غلام ہیں۔ سال میں ایک بار ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے مرشد سے عرض کیا کتنا اچھا ہو اگر مرنے سے پہلے مجھے اس کی اطلاع ہو جائے اور آثار مرگ کے ساتھ میں اپنی توجہ دوسری چیزوں سے ہٹا لوں۔ ارشاد ہوا جب تم اس سیراب پز کبود جامہ کو دوبارہ دیکھو گے تو یقین کر لینا کہ دوسرے سال تک زندہ نہ رہو گے۔ سمجھ لو کہ اب عمر بہت تھوڑی باقی ہے۔'' عم بزرگوار اس بات کو سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہا کہ انشاء اللہ میں اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھوں گا اور اس سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔

جب اس درویش سے باتیں ہوئیں تو اس نے کہا کہ کچھ دنوں سے میری دکان بالکل نہیں چلتی تھی اور اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ ایک روز میں نے اپنے پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا کہ وہ سرہانے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اے اسد اللہ ہر چند کہ سفر میں صعوبت بہت زیادہ ہے اور راستہ بھی دور کا ہے لیکن ایک بار تم علی متقی کے پاس ضرور جاؤ۔ میرے اور ان کے درمیان ایک اشارہ ہے جس کو وہ تمھارے جانے سے سمجھ جائیں گے۔ اس لیے جلدی جاؤ۔ اور کساد بازاری سے پریشان نہ ہو۔ وہاں سے واپسی پر تمھاری دکان خوب چلے گی۔'' میں نے دکان کو ایک شاگرد کے سپرد کیا اور سیدھا اکبر آباد کے لیے چل کھڑا ہوا۔

عید کا دن تھا چچا جان نے کپڑے بدلے اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد ان کے سینہ میں ایسا درد شروع ہوا کہ کسی کروٹ چین نہیں آیا۔ چہرہ کا رنگ بدل گیا اور صبر کی طاقت جاتی رہی۔ والد سے

Scanned by CamScanner

بلا کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ درد جان کے ساتھ جائے گا۔ دم گھٹا جاتا ہے اور صبر ہے کہ کسی طرح نہیں ہوتا۔ شام تک یہ درد سارے جسم میں پھیل گیا اور ان کی تکلیف سے دیکھنے والوں کے دل ہلنے لگے۔ فجر کی نماز کے وقت انھوں نے انتقال کیا اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

میر نے لکھا ہے کہ ان کے انتقال کا میرے والد کو بڑا صدمہ ہوا۔ اور وہ اپنے آپ کو ''عزیز مردہ'' کہنے لگے۔ خود میرے اوپر قیامت گزر گئی۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی ضرورتوں کو ان ہی سے کہتا تھا۔ اب دن اور رات سوائے ان کی یاد کے اور کچھ شغل نہیں تھا۔ والد بہتیری دلجوئی کرتے لیکن غم غلط نہ ہوتا۔ کبھی فرماتے کہ مجھے تیرا بڑا خیال ہے لیکن میں خود برسرِ راہ ہوں۔ کبھی کہتے خدا کا شکر ہے کہ دس برس کے ہو۔ اُس پر نظر رکھو اور اپنے دل کو مضبوط کرو۔ اس سے بڑا اور کوئی وارث نہیں۔

آخر وہ دن جس کا ڈر لگا ہوا تھا آ پہنچا۔ ایک روز آپ دوپہر میں محمد باعث کی عیادت کے لیے عالم گنج تشریف لے گئے۔ رات کو مجھ سے فرمانے لگے کہ مجھے تو لُو کا سا اثر ہے۔ اس وقت کچھ نہیں کھاؤں گا۔ صبح کو بیدار ہوئے تو خوب تیز بخار تھا حکیم ابوالفتح نے بہت سی تدبیریں کیں لیکن ایک بھی سودمند نہ ہوئی۔ یہ بخار رفتہ رفتہ دق میں تبدیل ہو گیا۔ اور غذا بالکل چھٹ گئی صرف نرگس کے پھول سونگھ لیتے تھے۔ ۲۱ رجب سے دوا بھی موقوف ہو گئی۔ اس روز حافظ محمد حسن کو جو میر کے بڑے بھائی تھے بلایا اور فرمایا کہ میں فقیر ہوں، کچھ نہیں رکھتا۔ یہ تین سو کتابیں ہیں ان کو آپس میں بانٹ لو۔ انھوں نے کہا ''میں طالب علم ہوں ان کتابوں کی مجھے ضرورت ہے۔ ان بھائیوں کو ان سے کیا واسطہ سوائے اس کے کہ ان کی پتنگ بنا کر اڑائیں یا پھاڑ ڈالیں۔'' والد کو یہ بات ناگوار گزری اور فرمایا: ''اگرچہ تو نے فقیری اختیار کی ہے لیکن تیرے نفس کی برائی نہیں گئی۔ ان کتابوں کو تو ہی لے لے لیکن یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے۔ میر محمد تقی تیرا دست نگر نہ ہوگا اور تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔'' اس کے بعد وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ ''مجھ پر تین سو روپے بازار کے قرض ہیں۔ جب تک وہ ادا نہ ہو لیں میری نعش نہ اٹھانا گھبراؤ نہیں۔ خدا کریم ہے۔ ہنڈی راستہ میں ہے۔ پہنچا ہی چاہتی ہے۔'' اس کے بعد میر کے حق میں دعا کی اور اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

Scanned by CamScanner

میرؔ کی پریشانی

میرؔ نے لکھا ہے کہ باپ کا مرنا تھا کہ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ دریا دریا گریستم۔ لنگر از کف دادم۔ سر را بر سنگ زدم بر خاک افتادم۔

بڑے بھائی نے ظاہر داری بھی چھوڑ دی۔ اور اس خیال سے کہ باپ مفلس مرا ہے، قرضخواہ دق کریں گے، پہلو تہی کرنے لگے اور کہنے لگے کہ جن کو انھوں نے ناز و نعم سے پالا ہے۔ وہ جانیں اور ان کا کام میں تو کسی کام میں نہ پہلے دخیل تھا اور نہ اب ہوں۔ میرؔ لکھتے ہیں کہ مجھے ان کی باتوں سے بڑا رنج ہوا لیکن خدا پر نظر کی اور صبر و استقلال سے کام لیا۔ بازار کے بقال دو سو روپے لے کر حاضر ہوئے لیکن میں نے قبول نہ کیے۔ اتنے میں مکمل خاں جو میرے عم بزرگوار کے مرید تھے۔ پانچ سو روپے کی ہنڈی لے کر آئے اور میرے رنج اور غم میں شریک ہوئے میں نے تین سو روپے تو فوراً قرض خواہوں کو دے دیے اور ایک سو روپے درویش کی تجہیز و تکفین میں صرف کیے اور ان کو پیر کے پہلو میں دفن کیا۔

میرؔ کی تربیت

میرؔ کی ابتدائی تعلیم سات برس کی عمر سے شروع ہوئی۔ انھوں نے قرآن شریف سید امان اللہ سے پڑھا جو ان کے والد کے خاص مریدوں میں سے تھے اور جن سے خود میرؔ بھی بے حد مانوس تھے۔ ذکر میرؔ میں لکھا ہے:

> ''من دراں ایام ہفت سالہ بودم۔ با خودم مانوس ساخت و در گریبانم انداخت لحظہ از خود جدا یم نمی کرد و بناز و نعم می پرورد۔ چنانچہ روز و شب با اوی ماندم و قرآن شریف بخدمت اوی خواندم۔''

میرؔ، سید امان اللہ کے ساتھ احسان اللہ، بایزید، اور اسد اللہ وغیرہ درویشوں کی صحبتوں میں بھی شریک رہے۔ سید صاحب کو اہل دل سے ملنے کا بہت شوق تھا اور چوں کہ میرؔ بھی ان کے بغل پروردہ تھے اس لیے وہ بھی ساتھ جاتے اور ان بزرگوں کی درد بھری باتیں سنتے۔ بچپن کی ان صحبتوں کا میرؔ پر بڑا اثر پڑا اور ان میں شروع ہی سے دردمندی اور قلندری کی شان پیدا ہو گئی اور

Scanned by CamScanner

اس کا رس ان کے کلام میں ہمیشہ باقی رہا۔ اولیا اللہ سے ان کی عقیدت بھی ہمیشہ قائم رہی اور میر اجمیر کے سفر میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی درگاہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔[۲۱]

خود میر کے والد بھی فقیر کامل تھے اور ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر درویش ان کا ادب اور احترام کرتا تھا اور ان کی دلسوزی اور وسیع المشربی کو سراہتا تھا۔ میر کو بھی انھوں نے اس عشق پیشگی کی تعلیم دی تھی جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ یہ باتیں ان کے دل میں اتر گئیں اور اس کا اثر جا بجا ان کے کلام میں جھلکتا ہے۔

میر کی عمر دس برس کی تھی کہ سید امان اللہ کا انتقال ہو گیا ۱۱۴۵ھ، ۱۷۳۲ء، اس سے میر کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان کے والد اکثر سمجھاتے تھے کہ:

''اے پسر من ترا بسیار می خواہم، لہٰذا ازیں غم می کاہم کہ من نیز بر سر راہم گاہ می گفت کہ ماہ من نہ طفل بالۂ، الحمد للہ کہ دہ سالۂ۔ چہ بہ کاہش افتادۂ آخر درویش زادۂ۔ دل قوی دار۔ خود را بخدا سپار۔''[۲۲]

اسی سال علی متقی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور میر کو لڑکپن ہی میں یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ اس وقت بقول ڈاکٹر عبدالحق ان کی عمر دس یا گیارہ برس کی تھی۔

باپ کے انتقال کے بعد میر پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس لاوارث اور خوددار بچہ نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ خود لکھتے ہیں:

''خدائے کریم مرا شرمندہ احسان کسے نہ کرد و دست نگر برادر کہ سر بہ سر من داشت نساخت۔ نقل ماتم درویش قسمت ساختم۔ کار را بہ لطف خداوندا نداختم دم خود را بہ برادر خورد سپردہ بتلاش روزگار در اطراف شہر استخواں شکستم لیکن طرفے نہ بستم یعنی چارۂ کار در وطن نیافتم۔ ناچار بہ غربت شتافتم۔ رنج راہ بر خود ہموار کردم۔ شدائد سفر اختیار کردم بہ شاہ جہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم، شفیقے ندیدم۔''

سر شاہ سلیمان کا خیال ہے کہ میر صاحب نے اس وقت اپنی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ عبدالباری آسی نے بھی اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''میر صاحب کا رسوم موتی ادا کرنا۔ معاملات کو طے کرنا۔ چھوٹے بھائی کو

Scanned by CamScanner

خانہ داری کے امور کا متکفل کر کے خود تلاش معاش میں پھرنا، اپنی غیرت اور خودداری کو کام میں لانا اور کسی سے کوئی امداد نہ چاہنا اور مزید برآں یہ کہ اپنے عم مرحوم یعنی سید امان اللہ کے ساتھ اکثر درویشوں اور خدا رسیدوں کی صحبت میں جا کر فیض اٹھانا۔ یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ایک دس بارہ برس کے بچے کے لیے موزوں ہوں۔ [۲۳] ''

لیکن عہد وسطیٰ میں یہ بات کچھ ایسی حیرت انگیز بھی نہیں تھی۔ بابر نے بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کی عنان حکومت سنبھالی۔ اکبر تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اس تھوڑی سی عمر میں اسے غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قسم کی مثالیں آج بھی مل جائیں گی۔

سید امان اللہ کے انتقال پر جب میرؔ کو سخت رنج اور ملال ہوا تھا تو ان کے والد نے ان کو سمجھایا تھا اور اس وقت ایک فقرہ یہ بھی کہا تھا:

ماہ من نہ طفل بالۂ۔ الحمدللہ کہ دہ سالۂ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد خود اسے بہت تھوڑی عمر خیال نہیں کرتے تھے۔ سید امان اللہ عید کے مہینے میں راہی عدم ہوئے ۱۱۴۵ھ، ۱۷۳۲ء اور والد نے رجب کے مہینہ میں وفات پائی۔ دسمبر ۱۷۳۲ء یہ میر صاحب کا بیان ہے اور اسے انھوں نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ لکھا ہے:

سیادت

میرؔ کی سیادت میں اختلاف ہے۔ ذکر میرؔ میں میرؔ نے سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ والد اور بھائی کسی کو سید نہیں لکھا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ میرؔ اپنے آپ کو سید کہتے تھے لیکن اس زمانہ میں کچھ لوگ اس دعویٰ پر حرف زن تھے۔ چنانچہ تذکرہ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت ان کو شاعری کے دربار سے عطا ہوا تھا۔ آزاد ہی کا بیان ہے:

''کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انھوں نے میرؔ تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اس وقت انھوں نے خیال نہ کیا۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ [۲۴] ''

Scanned by CamScanner

لیکن یہ غلط ہے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ اس وقت یہ شعر نہیں کہتے تھے۔ شعر گوئی کا خیال دلی آ کر پیدا ہوا ہے۔

آزاد نے سودا کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جو ان کے کلیات میں درج ہیں:

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر　　کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد　　بنا تو گندنا بنے اور آپ کو تھ میر

اس قسم کے اعتراضات کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "بدنظر زمانے کا دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامن شہرت کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہے تو ایک داغ لگا دیتا ہے۔" ان کے کلام میں کافی موثر شہادتیں ان کی سیادت کی موجود ہیں جن کو جھٹلانا آسان نہیں ہے:

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی　　ذات مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو
سید ہیں میر صاحب درویش دردمند　　سر رکھئے ان کے پاؤں پہ جائے ادب ہے یہ
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

مذہب

میر کے مذہب کے بارے میں بھی بہت سے شبہات ظاہر کیے گئے ہیں لیکن ان کے کلام میں جا بجا ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں جناب مرتضیٰ علی اور امام تشنہ کام کی خاص محبت تھی:

ع　قبلہ علی، امام علی، مقتدا علی
ع　تھا بزم لامکاں میں بھی رونق فزا علی
ع　تھا جانشین ختم رسل کا بجا علی
ع　مقصود خلق و مطلب ارض و سما علی

ایک مخمس میں فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معترضین کو جواب دے رہے ہیں:

قدر کو میری بہت ہے برتری　　کب مری خورشید سے ہو ہمسری
حکم بر رکھے ہے یاں شیر نری　　کر مخالف سوچ کرنگ اژدری
حیدری ہوں　حیدری ہوں　حیدری

Scanned by CamScanner

منقبت خوانی سے میری سب ہیں سُن اس سوا مجھ میں نہیں ہے کوئی گُن
ساتھ سر کے ہے علی گوئی کی دھُن مدعی اس کان یا اس کان سُن
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

ہے ولائے اہل بیت اپنا شعار جانے ہے اس کے تئیں سارا دیار
زیرِ لب کہتا ہوں میں پر اب کی بار تو سنے جو میں کہوں سب میں پکار
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اے مخالف بحث مت کرنا بکار بات ایسی سے ہے مجکو ننگ و عار
بس کہا اس آستاں کا ہوں غبار کیا کہا تجھ سے کروں میں بار بار
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اور آخر میں قسم کھا کر کہتے ہیں:

میر جی باور کرو واللہ میں
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

وہ "ولائے علی" کو "مسلمانی" سمجھتے تھے اور ان کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ

ہم علی کو خدا نہیں جانا پر خدا سے جدا نہیں جانا

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ مغلوں کے آخری زمانے میں سیاسی عنان اختیار بالکل ایرانیوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے "زوال سلطنت مغلیہ" میں لکھا ہے[۲۵] کہ ۱۷۴۴ء میں ایرانی اثر تمام دربار پر چھا گیا اور تورانی پارٹی کو شکست فاش ہو گئی۔ میر آتش کا عہدہ ایک تورانی سے لے کر صفدر جنگ ایرانی کو دے دیا گیا اور ۱۷۴۵ء میں بادشاہ کے ایماء سے صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ کی شادی، نواب اسحاق خاں دوم نجم الدولہ کی بہن سے کر دی گئی۔ یہی خاتون وارن ہسٹنگز کے مظالم کا ہدف بنیں اور تاریخ میں نواب بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس رشتے نے ایرانی اثرات کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۳۶ء سے مغلوں کی تاریخ ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش کی داستان ہے۔ سیاست کے علاوہ ادب[۲۶] اور مذہب کے میدان میں بھی یہ آویزش نظر آتی ہے۔ ذکر میر میں اس کی طرف ہلکا سا اشارہ ہے جس سے میر کے معتقدات بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میر جب تیس برس کے بعد آگرہ

Scanned by CamScanner

گئے ہیں تو ایک عالم کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے میر کی تسبیح خاک شفا پر اعتراض کیا اور کہا:

این تسبیح خاک امام شما کہ موجب غبار خاطر ما صفاپیشگاں است دلیل است کہ شما میل بہ رفض دارید۔ اگر در واقع چنیں است، مرا بحال من واگذارید۔

میر صاحب نے فرمایا:

''مرا نیز ہمیں تردد بود، الحمد للہ کہ صاحب سنی برآمدند۔''

اس کے بعد میر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ احمق میرے کنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا۔

بے مزہ تر شدم و برخاستہ آمدم [۲۷]

میر کے مذہب اور مشرب پر ان کی ابتدائی تربیت اور ماحول کا بھی اثر ہے۔ اپنے والد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''روزے در خدمت شیخ (کلیم اللہ اکبرآبادی) سوال کرد کہ بندہ انچہ عقائد خود درست کردہ ام بخدمت عالی واضح است اما در حق حاکم شام چہ می فرمایند۔''

شیخ نے کہا ''پھر بتاؤں گا۔''

کچھ مدت کے بعد منھ اندھیرے محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے نوکر ان کے وضو کے لیے پانی لینے دوڑے۔ والد خود اٹھے اور آفتابہ لے کر وضو کرانے لگے۔ اس وقت شیخ نے فرمایا اے (علی متقی) اس کا نام آج تک میری زبان پر نہیں آیا ہے۔ کس منہ سے خدا کا شکر ادا کروں۔ والد کہتے تھے کہ اس کے بعد سے میں نے بھی اس کا نام (معاویہ) کبھی نہیں لیا۔ [۲۸]

حقیقت یہ ہے کہ میر وسیع المشرب، صلح کل اور فقیر دوست تھے۔ ان کو ابتدا سے آخر تک جب وہ اجمیر کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، اولیائے کرام سے عقیدت رہی ہے۔ ان کی شیعیت اور صوفیت میں تضاد نہیں۔ لطیف ہم آہنگی ہے۔ یہ ربط ان کی ابتدائی تربیت اور فطری دردمندی نے پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کوئی فکری عقیدہ تنگ دائرہ میں محدود نہ ہو سکا۔ تصوف اس زمانے کی فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار تھا۔ وحدت الوجود کا عقیدہ جذب اور سلوک اور معرفت کے لیے واحد بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیاقت، علمیت، بلند مذاقی اور بلند نظری سب

Scanned by CamScanner

میں یہی صوفیانہ طریق رچا ہوا تھا۔ ولی کے بعد میر و سودا کے اواخر عہد تک یہی نظریہ مذہب، اخلاق اور شعر و ادب میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں بڑی وسعت کے ساتھ رائج رہا۔[۲۹] چنانچہ میر نے بھی اس مسلک کو جس کی بنیاد محبت کے وسیع تر حقائق پر ہے، اپنی زندگی اور شاعری میں برتا۔ اس سے نہ صرف ان کی بے چینیوں کو رومان انگیز تسلی نصیب ہوگئی بلکہ شاعری کی تاثیر بھی بڑھ گئی۔

دہلی کا پہلا سفر

والد کے انتقال کے بعد میر بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ انھوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں لیکن کسی کے آگے دست سوال نہیں پھیلایا۔

> ''زنہار بر در کس نہ ایستادم۔ لبم بحرف طلب آشنا نگردید۔ چشم من بہ ہیچ چیز ندید۔ سایہ دست کسے نہ گرفتم۔ دمر دستے بمن کسے نگرفت یعنی خدائے کریم مرا شرمندۂ احسان کسے نکرد و دست نگر برادر کہ سر بسر من داشت، نساخت۔''

انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا قائم مقام بنایا اور خود تلاش معاش میں نکل پڑے پہلے تو اطراف شہر میں پھرتے رہے۔ جب کوئی صورت نہ نکلی تو وطن کو خیر باد کہہ کر مسافرت پر کمر باندھی اور دہلی پہنچے۔ وہاں بھی کوئی شفیق اور دستگیر نہ ملا۔ آخر خواجہ محمد باسط[۳۰] نے جو صمصام الدولہ امیر الامراء کے بھتیجے تھے ان کی مدد کی اور ان کو امیر موصوف کے پاس لے گئے۔ انھوں نے پوچھا۔ یہ کس کا لڑکا ہے۔ کہا میر محمد علی کا۔ فرمانے لگے کہ اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ راہی عدم ہوئے۔ بہت افسوس اور رنج کرنے کے بعد کہنے لگے کہ اس شخص کے مجھ پر بہت سے حقوق ہیں۔ اس لڑکے کو ایک روپیہ روز ہماری سرکار سے دیا جائے۔ میر نے عرض کیا کہ نواب صاحب از راہ کرم تحریری حکم صادر فرمادیں تاکہ متصدیوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے درخواست نکالی۔ فرمایا یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے۔ میر لکھتے ہیں کہ یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ نواب نے پوچھا۔ کیوں میاں کیوں ہنسے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھا۔ اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بردار حاضر نہیں ہے تو مضائقہ نہ تھا یا یہ کہتے کہ

Scanned by CamScanner

یہ دستخط کا وقت نہیں ہے تو صحیح تھا لیکن یہ کہنا کہ وقتِ قلمدان نہیں ہے، نیا محاورہ ہے۔ قلمدان تو لکڑی کا ہے۔ وقت اور غیر وقت کو نہیں جانتا جس سے کہیے وہ اٹھا لائے۔ اس پر نواب ہنسنے لگے اور کہا ٹھیک کہتے ہو۔ قلمدان منگا کر عرضی پر دستخط کر دیے اور مجھے بہت لطف و عنایت کے ساتھ رخصت کیا۔

میر کو یہ روزینہ نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) تک ملتا رہا:

''تا عہدے کہ نادر شاہ بر محمد شاہ کہ حالا بفردوس آرام گاہ ملقب است، مسلط شد و نواب مذکور سبب پیش جنگی کشتہ افتاد، [۳۱] آں۔ روزینہ می یافتم، نان و نمک می خوردم و بسر می بردم۔ [۳۲]''

عبدالباری آسی نے لکھا ہے کہ خواجہ باسط امیر الامرا کی خدمت میں کبھی ایک بچہ کی درخواست پیش نہ کرتے۔ لامحالہ میر کی عمر سترہ برس کی تھی۔ [۳۳] یہ دلیل قطعی نہیں ہے۔ میر محمد علی سے امیر الامرا کو بڑی عقیدت تھی۔ بہت ممکن ہے کہ ان کی موت اور میر کی کم عمری ہی کا خیال کر کے، امیر موصوف نے میر کا ایک روپیہ روز مقرر کر دیا ہو۔ ''وقت قلمدان نیست۔'' پر میر کا اعتراض اور امیر الامرا کا برا نہ ماننا یہ بھی ان کی کم عمری اور معصومیت کی دلیل ہے۔

گذشتہ صفحات میں میر کے دیوان چہارم کے نسخۂ محمود آباد کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر نوادر الکملا کے حوالہ سے لکھا ہے:

..... بعد واقعۂ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت۔ [۳۴]

لیکن آسی کو اس ''سترہ برس'' کا یقین نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

سترہ نہ سہی، تو یہ اپنے والد کے انتقال کے وقت تیرہ چودہ برس کے ضرور تھے۔ [۳۵]

نوادر الکملا کے بیان سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میر محمد علی کے انتقال کے وقت میر کی عمر سترہ برس کی تھی جیسا کہ آسی کو بھی گمان ہوا ہے لیکن یہ صریحاً غلط اور میر کے بیان کے خلاف ہے۔ [۳۶] دوسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ میر محمد علی کے انتقال کے وقت میر کی عمر دس برس ہی کی تھی جیسا کہ خود میر نے لکھا ہے۔ [۳۷] لیکن وہ سات برس آگرہ ہی کے قرب و جوار میں نوکری ڈھونڈتے رہے۔ یہ بھی درایت اور قیاس کے خلاف ہے۔ جو کچھ ذکرِ میر سے مستنبط ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ باپ کے انتقال سے لے کر نادر شاہ کے حملے سے قبل تک میر اطراف اکبر آباد میں

Scanned by CamScanner

گھوے۔ دہلی میں نوکری تلاش کی اور کافی سرگردانی کے بعد صمصام الدولہ کے یہاں سے روزینہ مقرر ہوا۔ جو کچھ مدت تک اُن کو ملتا رہا۔

آسی کا بیان کہ دہلی آنے کے وقت میرؔ کی عمر سترہ برس کی تھی، [۳۸] درست نہیں انھوں نے ذکر میرؔ کے تین اہم جملوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میر محمد علی کے انتقال اور میرؔ کے دہلی پہنچنے میں ایک وقفہ ہے وہ اپنے باپ کے انتقال کے فوراً بعد دہلی نہیں گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

تلاش روزگار در اطراف شہر استخواں شکستم لیکن طرفے نہ بستم۔ [۳۹]

دہلی آنے کے بعد بھی میرؔ کی رسائی امیر الامرا کے دربار میں فوراً نہیں ہوئی۔

بشاہ جہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم۔ شفقے ندیدم۔ [۴۰]

تیسری بات یہ ہے کہ میرؔ کو امیر الامراء کے دربار سے کچھ مدت تک یہ روزینہ یک گونہ اطمینان کے ساتھ ملتا رہا۔ اس کے بعد یہ بساط الٹی ہے اور وہ بیروزگار ہوئے ہیں۔

آں روزینہ می یافتم۔ نان و نمک می خوردم و بسری بردم۔ [۴۱]

اس لیے ہمارا خیال ہے کہ جب میرؔ پہلی بار دہلی آئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس سے کم تھی لیکن نادر شاہ نے جب دلی کو لوٹا ہے (۱۷۳۹ء) اس وقت وہ ضرور سترہ برس کے تھے۔ ہم نے ان کا جو سالِ ولادت قرار دیا ہے ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء، اس کی رُو سے بھی وہ نادر شاہ کے حملے کے وقت ۱۱۵۲ھ، ۱۷۳۹ء سترہ برس کے نکلتے ہیں۔

وطن کی واپسی

نادر شاہ کے ہنگامہ کے بعد میرؔ دلّی سے پھر اکبر آباد آ گئے لیکن وطن میں اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ خود لکھتے ہیں:

کسانیکہ پیش درویش خاکپائے مرا کحل بصری ساختند یکبار از نظرم انداختند، ص۔ ۶۳

دہلی کا دوسرا سفر

اس لیے میرؔ نے دوبارہ تقریباً (۱۱۵۲ھ) میں دلی کا رخ کیا اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا۔ کچھ دنوں ان کے پاس رہے اور بعض احباب سے کتابیں

Scanned by CamScanner

بھی پڑھتے رہے۔[۴۲] اسی زمانہ میں ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے خان آرزو کو لکھا:

میر محمد تقی فتنہ روزگار است زنہار بہ ترتیب او نہ باید پرداخت۔

میر لکھتے ہیں کہ خان آرزو دنیا دار آدمی تھے۔ بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے آزار ہو گئے۔

نظر بر خصومت ہمشیر زادہ خود بدمن اندیشید۔

تعلیم

ابھی میر کی تعلیم نامکمل تھی اور وہ رسمی درسیات کی تکمیل بھی نہ کر سکے تھے کہ ان کے 'چچا' اور باپ دونوں کا انتقال ہو گیا اور وہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس وقت ان کی عمر دس برس کی تھی۔[۴۳] لیکن کم عمری میں بھی ان کو درست اور نادرست محاورہ کا احساس تھا۔ دہلی میں ''وقت قلمدان نیست'' پر ان کا اعتراض، ان کے تنقیدی شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے اندر خود اعتمادی اور جرأت پیدا ہو گئی تھی جو ہر اچھی تعلیم کا لازمی جزو ہے۔

میر جب دوبارہ دلی آئے تو اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے یہاں ٹھہرے۔ یہ علم و فضل میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور امام المتاخرین کے لقب سے مشہور تھے۔ لیکن میر کے سوتیلے بھائی محمد حسن کے لکھنے پر کہ ''میر محمد تقی فتنہ روزگار است۔ زنہار بہ تربیت اُو نباید پرداخت'' ان کے درپے آزار ہو گئے۔ یہ جملہ خود اس کی غمازی کرتا ہے کہ خان آرزو نے ان کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی تھی۔ اس کے علاوہ بھائی کا خط بھی اس وقت آیا جب یہ کسی لائق ہو گئے۔ اور پڑھے لکھے آدمی انھیں اپنا مخاطب کر سکتے تھے۔

''چوں قابل ایں شدم کہ مخاطب صحیح کسے می توانم شد۔ نوشتۂ اخوان پناہ رسید
کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار است در پردۂ دوستی کارش باید ساخت۔''

میر اور خان آرزو کی تصانیف کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کے غنچۂ استعداد کی شگفتگی، خان آرزو کی مرہون منت ہے۔ میر نے محض استاد کے الفاظ و تراکیب ہی کی خوشہ چینی نہیں کی بلکہ زبان کے قواعد و ضوابط بھی خان آرزو سے سیکھے ہیں۔[۴۴]

میر نے نکات الشعرا میں خان آرزو کو استاد و پیر و مرشد بندہ لکھا ہے۔ لیکن ذکر میر میں جو

Scanned by CamScanner

نکات الشعرا اور خان آرزو کے مرنے کے بعد لکھی گئی ہے انھوں نے خان آرزو کی ''سلاخی اور حلاجی'' کی شکایت کی ہے اور تمام معاصر تذکروں کے خلاف میر جعفر عظیم آبادی، سعادت امروہوی اور ''یاران شہر'' سے فیض یاب ہونے کا ذکر کیا ہے۔

میر جب جنون سے صحت یاب ہوئے تو انھوں نے مکتوبات اور انشا کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ (''وشروع بخواندن ترسل کردم'' ص ٦٦) ایک روز وہ بازار میں ایک کتاب کا جزو لیے بیٹھے تھے کہ ایک شخص میر جعفر نام، ملک سیرت، آدم صورت ادھر سے گزرا۔ اس نے کہا معلوم ہوتا ہے تمھیں پڑھنے کا شوق ہے۔ اگر واقعی ہے تو میں پڑھانے کے لیے آجایا کروں۔ انھوں نے کہا میں آپ کی کوئی خدمت تو کر نہیں سکتا۔ اگر آپ یوں ہی یہ زحمت گوارا فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ انہوں نے کہا مگر بغیر ناشتہ کے میرے لیے کہیں آنا جانا ممکن نہیں ہے۔ کہا ''میں خود تنگدست ہوں مگر خدائے کریم یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔'' میر نے لکھا ہے کہ میر جعفر بڑی دماغ سوزی سے پڑھاتے اور مجھ سے بھی جہاں تک بن پڑتا ان کی خدمت کرتا۔ ناگاہ ان کے وطن سے ایک خط آیا اور وہ اسے دیکھتے ہی چل کھڑے ہوئے۔

کچھ دنوں کے بعد میر کی ملاقات سعادت علی سے ہوگئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دلائی۔ اور میر نے بھی ایسی مشق بہم پہنچائی کہ شہر کے مستند شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

سعادت امروہوی

میر سعادت علی [٤٥] سعادت امروہوی حضرت شاہ ولایت کی اولاد میں تھے قائم نے لکھا ہے کہ وہ اپنے اقران و امثال میں ممتاز تھے اور انھوں نے چالیس برس سے کم عمر میں بعارضہ تپ محرقہ انتقال کیا۔ [٤٦] میر حسن نے ان کی کم سخنی اور درویشی کے ساتھ ان کی ایہام گوئی کا بھی ذکر کیا ہے۔:

میل ایہام بندی بسیار داشت

میر نے اسی ایہام گوئی پر ضرب لگائی تھی۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ سعادت نے ایک مثنوی لیلی مجنوں لکھی ہے۔ [٤٧] یہ دو عاشق و معشوق، نواب قمرالدین خاں کے زمانے میں دہلی میں

Scanned by CamScanner

گزرے ہیں۔ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ سعادت امروہوی کا کلام اس وقت کے رواج کے مطابق ہے لیکن بے کیفیت نہیں ہے۔ [۴۸] نمونۂ کلام یہ ہے:

کس سے پوچھوں دل گیا چوری مرا زلفوں میں رات
ایک جو شانہ ہے سو وہ تیل میں ڈالے ہے ہات

مثل آئینہ سادہ رویوں کی منہ ہی دیکھے کی آشنائی ہے
ہوش کھو دیتی ہیں میرا اس کی آنکھیں مے پرست

بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہو جاتا ہوں مست

سعادت کا ذکر قائم، میر حسن، مصحفی، لطف، نساخ، شفق، باطن، قاسم، شیفتہ، اور گردیزی وغیرہ نے کیا ہے لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ وہ میر کے استاد ہیں۔ میر نے بھی صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ میری شعر گوئی کے محرک ہوئے تھے۔

''بعد از چندے با سعادت علی نام، سیدے کہ از امروہہ بود برخوردم۔ [۴۹] آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی، بزبانِ اردوئے معلی بادشاہ ہندستان و در آں وقت رواج داشت کرد، خود کشی کردم و مشق خود بمرتبہ رساندم کہ موزونانِ شہر را مستند شدم۔ شعر من در تمام شہر دوید و بگوشِ خرد و بزرگ رسید۔ [۵۰]''

شعر گوئی

میر کا یہ بیان کہ ''موزونانِ شہر را مستند شدم'' حرف بہ حرف صحیح ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں دیوان زادۂ حاتم کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس میں حاتم کی ایک غزل ہے جو انھوں نے میر کی طرح میں کہی ہے۔ اس غزل کے عنوان پر سن ۱۱۵۴ھ (مطابق ۱۷۴۱ء) درج ہے۔ [۵۱] حاتم کی اس غزل کے تین شعر یہ ہیں:

زمین طرحی میر ۱۱۵۴ھ

اس کی نظروں میں دوئی سے جو کہ ہے نا آشنا — ایک سے دونو ہیں کیا بیگانہ و کیا آشنا
دوستی آپس کی ہمگی زندگانی کا مزا — ہے عجب صحبت جہاں باہم ہوں یکجا آشنا

Scanned by CamScanner

گرم ہو ملنا ہے سب اہلِ جہاں کا بے ثبات آشنا چاہے تو ہو حاتم خدا کا آشنا

میر نے اُردو میں شعر کہنا کب شروع کیے۔ یہ قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن حاتم کی اس غزل سے جو انھوں نے ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں میر کی زمین میں کہی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹ برس کی عمر میں میر کی شاعری کی شہرت خرد و بزرگ تک پھیل چکی تھی۔ اور اردو کے اکابر شعراء ان کی طرحوں میں غزلیں لکھتے تھے۔

۱۷۴۸ء میں میر رعایت خاں کے نوکر ہو گئے۔ یہ عظیم اللہ خاں کے بیٹے اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے بہنوئی تھے اور میر سے ان کو شعر گوئی کی وجہ سے عقیدت تھی۔ اس وقت میر کی عمر ۲۶ برس کی تھی اور ان کی شہرت بہ حیثیت شاعر کے دور تک پھیل چکی تھی۔ ۱۷۵۱ء میں انھوں نے تذکرۂ نکات الشعرا لکھا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کی ادبی محفلوں اور مراختوں میں شرکت کرتے اور خود بھی مشاعرے کرتے تھے۔ لوگ ان کے اشعار کی دل و جان سے قدر کرتے اور بطور تحفہ کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھیجتے تھے۔

۱۷۵۳ء میں میر نے اپنے استاد اور پیر و مرشد خان آرزو کی ہمسائیگی بھی چھوڑ دی اور امیر خاں مرحوم کی حویلی میں رہنے لگے۔ خان آرزو بھی شجاع الدولہ کے مسند نشین ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہیں راہی عدم ہوئے (۱۷۵۵ء) استاد کے مرنے کے بعد میر کی عزت اور شہرت اتنی بڑھ گئی کہ راجہ جگل کشور جیسے صاحب ثروت خود انھیں اپنے گھر لے جاتے اور خاطر داری اور دلداری میں کسر نہ کرتے لیکن اسی کے ساتھ میر کی تمکنت بھی بڑھتی گئی۔ جس کے بہت سے نفسیاتی اسباب ہیں۔

میر جب ۱۷۶۱ء میں آگرہ گئے ہیں تو لوگ انھیں سرآمدِ فن شاعری سمجھتے تھے اور ہر وقت ان کے پاس شاعروں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان کے علم و فضل سے زیادہ، ان کے شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور یہ کمال حقیقتاً ان کو مبداء فیاض سے ملا تھا۔ لیکن ان کی تصانیف اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ انھوں نے فارسی میں ادیب کامل کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور عربی میں مطول تک استعداد بہم پہنچالی تھی۔ ذکر میر اور فیض میر کی زبان ادنیٰ درجہ کی لیاقت کو ظاہر نہیں کرتی اس کے لیے واقعی ''خود کشی'' اور ''جہد بلیغ'' کی ضرورت ہے۔ رہی اُردو، وہ ان کی اپنی زبان ہے اور سند ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے فیضان اور خمار چشم ساقی کی آمیزش نے اس

Scanned by CamScanner

میں گہر کی سی آبداری پیدا کر دی ہے:

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

اس کے علاوہ میر کی نظر، اردو زبان کے قواعد وضوابط پر بھی بہت گہری تھی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سنگریزہ، اُن ہی کی کوششوں سے درِ عدن بن گیا تھا۔ ورنہ اس لچری زبان کی طرف کون متوجہ ہوتا۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

الفاظ بے جان چیز ہیں۔ ان میں جان، دل کی گلابی سے پڑتی ہے۔ میر نے اس کا ڈھب اپنے داخلی اور خارجی ماحول کے مدرسہ میں اچھی طرح سیکھ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ آج تک بزمِ سخن میں ''میر کی میر مجلسی مسلّم ہے۔''

میر اور خان آرزو

میر اور خان آرزو کے تعلقات بحث وتمحیص کا موضوع رہے ہیں، اس لیے ان پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے:

میر نے نکات الشعرا میں سراج الدین علی خاں آرزو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''آب ورنگ باغ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزار معانی، متصرف ملک زور طلب بلاغت پہلوان شاعر عرصہ فصاحت، چراغ دودمان صفائی گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً۔ شاعر زبردست قادر سخن، عالم فاضل تا حال ہمچو ایشاں بہ ہندوستان جنت نشاں بہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود..... حاصل کمالات اوشان از حیز بیان بیرون است ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگرداں آں بزرگوارند گاہے برائے تفنن طبع دوسہ شعر ریختہ فرمودہ ایں بے اعتبار را کہ اختیار کردہ ایم، اعتبار دادہ اند۔[۵۲]''

اس کے علاوہ میر نے موسوی خاں فطرت کے حال میں خان آرزو کو پیر و مرشد بندہ

Scanned by CamScanner

میں گہری سی آبداری پیدا کردی ہے:

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

اس کے علاوہ میرؔ کی نظر، اردو زبان کے قواعد وضوابط پر بھی بہت گہری تھی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سنگریزہ، اُن ہی کی کوششوں سے درِ عدن بن گیا تھا۔ ورنہ اس لچری زبان کی طرف کون متوجہ ہوتا۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

الفاظ بے جان چیز ہیں۔ ان میں جان، دل کی گلابی سے پڑتی ہے۔ میرؔ نے اس کا ڈھب اپنے داخلی اور خارجی ماحول کے مدرسہ میں اچھی طرح سیکھ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ آج تک بزمِ سخن میں ''میرؔ کی میر مجلسی مسلّم ہے۔''

میرؔ اور خان آرزو

میرؔ اور خان آرزو کے تعلقات بحث وتمحیص کا موضوع رہے ہیں، اس لیے ان پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے:

میرؔ نے نکات الشعرا میں سراج الدین علی خاں آرزو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''آب ورنگ باغ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزار معانی، متصرف ملک زور طلب بلاغت پہلوان شاعر عرصہ فصاحت، چراغ دودمان صفائی گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً۔ شاعر زبردست قادر سخن، عالم فاضل تا حال ہیچ ایشاں بہ ہندوستان جنت نشاں بہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود..... حاصل کمالات اوشان از حیز بیان بیرون است ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگرداں آں بزرگوارند گاہے برائے تفنن طبع دوسہ شعر ریختہ فرمودہ ایں بے اعتبار را کہ اختیار کردہ ایم، اعتبار دادہ اند۔[۵۲]''

اس کے علاوہ میرؔ نے موسوی خاں فطرت کے حال میں خان آرزو کو پیر و مرشد بندہ

Scanned by CamScanner

لکھا ہے۔[۵۳]

لیکن میرؔ نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ذکر میرؔ میں جو بعد کی تصنیف ہے اس کے خلاف واقعات بیان کیے ہیں۔ اس میں نہ خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور نہ ان کے پیر و مرشد ہونے کا۔ ذکر میرؔ ۱۱۸۵ھ، ۱۷۷۱ء[۵۴] میں شروع ہوئی اور ۱۲۰۳ھ، ۱۷۸۸ء میں ختم ہوئی۔ تذکرۂ نکات الشعرا اس سے قبل ۱۱۶۵ھ ۵۲۔۱۷۵۱ء میں لکھا گیا۔[۵۵] یہ نہایت اہم سوال ہے کہ میرؔ نے ذکر میرؔ میں خان آرزو کی کیوں برائی کی جب کہ وہ تذکرۂ نکات الشعرا میں ان کی اس قدر عقیدت اور محبت کے ساتھ تعریف کر چکے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ تذکرہ ایک عام چیز تھی اور سب لوگوں کی نظر سے گزرنے والی۔ اس لیے میرؔ نے خانگی اختلافات کو اس میں داخل نہیں کیا ذکر میرؔ ایک حد تک پرائیویٹ چیز تھی اس لیے یہاں اختلافات کے چہرہ سے نقاب اٹھادی ہے۔ یہ دلیل قطعی اور وزنی قرار نہیں دی جا سکتی۔ بالخصوص جب کہ ذکر میرؔ میں بعض ان امور سے ابائے کلی برتا گیا ہے جن کا نکات الشعرا میں بڑے اہتمام سے ذکر ہے۔

میرؔ باپ کے مرنے کے بعد تلاش معاش میں دلّی آئے اور امیر الامرا کے نوکر ہو گئے لیکن ۱۱۵۱ھ، ۱۷۳۹ء میں امیر الامرا نادر شاہ کے ہنگامہ و آشوب میں مارے گئے اس لیے میرؔ بے روزگار ہو کر دلّی سے اکبر آباد آ گئے۔ لیکن یہاں لوگوں نے ان کے باپ کی محبت کا کچھ پاس اور لحاظ نہ کیا اور جو لوگ ان کی خاک پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، انھوں نے یک بیک نظر سے گرا دیا۔[۵۶]

ناچار میرؔ دوبارہ دلّی گئے، (غالباً ۱۱۵۲ھ، ۴۰۔۱۷۳۹ء) میں لیکن یہاں خان آرزو نے بدسلوکی کی۔ حافظ محمد حسن جو میر کے سوتیلے بھائی تھے، انھوں نے خان آرزو کو لکھا کہ:

> ''میر محمد تقی فتنۂ روزگار است۔ زنہار بہ تربیت او نباید پرداخت و در پردۂ دوستی کارش باید ساخت۔ آں عزیز دنیادار واقعی بود، نظر بہ خصومت ہمشیرزادۂ خود بدمن اندیشید..... چہ بیاں کنم کہ از و چہ دیدم چہ گویم کہ چہ حالت کشیدم۔ ہر چند پنبہ دہانی اختیار کردم او از حلاجی دست نمی داشت باصد ہزار احتیاج یک روپیہ از و نمی خواستم۔ اما سلاخی نمی گزاشت خصمئی او اگر بہ تفصیل بیان کردہ آید۔ دفترے جداگانہ می باید۔ خاطر گرفتہ من گرفتہ

Scanned by CamScanner